وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ

شعائر اللہ کی عظمت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

جمع و ترتیب

محمد ارمغان بدایونی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول

محرم الحرام ۱۴۴۲ھ - ستمبر ۲۰۲۰ء

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی

دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

کتاب	:	شعائر اللہ کی عظمت
مصنف	:	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۸۰
جمع و ترتیب	:	محمد ارمغان بدایونی ندوی
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبہ احسان، لکھنؤ

☆ مکتبة الشباب العلمية، ندوہ روڈ، لکھنؤ

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

عرض ناشر ---------- ۶
پیش لفظ ---------- ۹

شعائر اللہ کی عظمت - ایک مختصر تعارف

پہلا شعار ---------- ۱۳
دوسرا شعار ---------- ۱۴
تیسرا شعار ---------- ۱۴
چوتھا شعار ---------- ۱۵

قرآن مجید کی عظمت

کلام الٰہی کی عظمت ومقبولیت ---------- ۱۷
کلام الٰہی کی طاقت ---------- ۱۹
کلام الٰہی کی مثال ---------- ۲۲
زمین آسمان کا فرق ---------- ۲۳
نزول قرآن کا مقصد ---------- ۲۴
نزول قرآن کی حکمت ---------- ۲۴

www.abulhasanalinadwi.org

قرآن مجید کی قدر ---------- ۲۵
آدابِ قرآنی ---------- ۲۷
دنیاوی واخروی نظام ---------- ۲۸
قرآنی تعلیمات پر عمل کا نتیجہ ---------- ۲۸
انسانی مخلوق کا امتیاز ---------- ۳۱
انسان اور دیگر مخلوقات کا فرق ---------- ۳۲
انسان کی ممتاز صفات کا مقصد ---------- ۳۳
مادی ومعنوی نظام کا فرق ---------- ۳۴

کعبۃ اللہ کا مقام

منی، مزدلفہ اور عرفات ---------- ۳۶
خاندان ابراہیم کی مکہ آمد ---------- ۳۷
مکہ کی آبادی کی بنیاد ---------- ۳۹
اعزاز براہیمی ---------- ۳۹
بیت اللہ کی فضیلت ---------- ۴۰
آسمانی نسبت کا فرق ---------- ۴۲
نعمت غیر مترقبہ ---------- ۴۲
کعبہ دنیا کا مرکزی نقطہ ---------- ۴۳
عظیم ترین مقام ---------- ۴۴

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی

دین اسلام کی طبعی تاثیر ---------- ۴۶
رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ---------- ۴۷

www.abulhasanalinadwi.org

قدردانی کا مطالبہ ---------- ۴۸
محبت رسول ﷺ ---------- ۴۹
صحابہ کرام کا عشق رسول ---------- ۵۱
ایمان کامل کا تقاضا ---------- ۵۲
آداب نبوی ﷺ ---------- ۵۳
اخلاق نبوی ﷺ ---------- ۵۴
بلند آواز سے ممانعت ---------- ۵۶
احتیاط کی تعلیم ---------- ۵۷
صحابہ رضی اللہ عنہم کی احتیاط ---------- ۵۹
بلند آواز سے پکارنے کی ممانعت ---------- ۶۰
معاشرتی تعلیمات اور مقام نبوی ---------- ۶۳
امت مسلمہ کے لیے پیغام ---------- ۶۵

نماز کی اہمیت

محبوب عمل ---------- ۶۶
دیگر عبادات اور نماز میں فرق ---------- ۶۷
نماز مؤمن کا ہتھیار ---------- ۶۸
انسان کی برتری ۶۹
دیگر مخلوقات کا طرز عبادت ۷۰
موزوں طریقہ عبادت ۷۴
نماز کے متعلق ہدایات ۷۸

www.abulhasanalinadwi.org

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

عرض ناشر

''شعار'' عربی میں اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم سے متصل ہو، ''شعائر'' اسی کی جمع ہے، شعائر اللہ سے مراد وہ بلند ترین اللہ سے نسبت رکھنے والی چیزیں ہیں جو بلا واسطہ اللہ سے قریب ہوں، اس قرب سے ان کے اندر عظمت و بلندی کی وہ شان پیدا ہو جاتی ہے جو دوسری جگہ ممکن نہیں اور جن دلوں میں شعائر اللہ کی عظمت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان دلوں کو بھی عظمت والا بنا دیتے ہیں، اس لیے کہ عظمتِ شعائر سے دلوں میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (الحج:٣٢)

(اور جس نے شعائر اللہ کی تعظیم کی تو یقیناً یہ دل کے تقویٰ کی بات ہے)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ١٣)

(بلاشبہ اللہ کے یہاں تم میں سے بڑا عزت دار وہ ہے جو تم میں سب سے بڑا پرہیزگار ہو)

شعائر اللہ میں بلند ترین چار شعائر ہیں، جو اس کتاب کا موضوع ہیں؛ کلام اللہ، بیت اللہ، نبی اللہ اور نماز جو عبادۃ اللہ کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت و محبت کو ترقی کا ذریعہ بتایا ہے اور یہ ایک طبعی بات

ہے، یہ بلند و بالا شعائر آسمانی صفت رکھنے والے ہیں اور زمین کی پستی میں آسمان کی بلندیاں ان میں مضمر ہیں، جو اپنے آپ کو ان سے وابستہ کرے گا تو وہ بھی بلند ہوتا چلا جائے گا اور جو اس کے برعکس ان شعائر کی بے توقیری کرے گا وہ زمین کی پستی میں دھنستا چلا جائے گا اور اس کو جہنم کا ایندھن بنا دیا جائے گا، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾(الحج: ۲۵)

(اور جو اس میں شرارت سے کجی کا ارادہ بھی کرے گا تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے)

یہ حرم کی عظمت ہے، اس خطہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی خصوصیات بخشی ہیں اور وہاں کے اعمال کو عام دنیا کے اعمال کے مقابلہ ایک لاکھ گنا بلند کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے جو مقام بلند عطا فرمایا، وہ کسی کو نہ دیا اور دنیا میں جو جس کو ملا وہ آپ ﷺ سے ملا، اللہ کی کتاب بھی آپ ﷺ کے ذریعہ سے ملی اور دین و شریعت کا سارا نظام اور کامیابی کے راستے آپ ﷺ سے ملے۔

کتاب اللہ، اللہ کا کلام ہے، اللہ کی صفت ہے، دنیا میں اس سے بڑی چیز کیا ہوگی، اس کی طاقت تو وہ تھی کہ خود اللہ فرماتا ہے:

﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللّهِ﴾ (الحشر: ۲۱)

(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے رعب سے دبا جا رہا ہے، پھٹا پڑتا ہے)

لیکن اللہ نے اپنے نبی کے ذریعہ سے اس کو آسان فرما دیا اور نماز مؤمن کی معراج ہے، ایک بندہ اس کے ذریعہ سے اللہ سے قرب حاصل کرتا ہے اور زمین کی پستی سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔

شعائر اللہ اور بھی ہیں لیکن یہ چار وہ ہیں جو سب سے بڑھ کر ہیں، اس کتاب میں ان ہی پر گفتگو کی گئی ہے اور اس انداز سے کی گئی ہے کہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ کے یہ مختلف دروس اور تحریریں تھیں، جن کو عزیز القدر مولوی محمد ارمغان بدایونی ندوی سلمہ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب کیا ہے، حضرت والا نے اس کو ملاحظہ فرمایا اور تکمیل فرمائی، اس طرح یہ ایک مکمل اور مفید رسالہ کی شکل میں ناظرین کی خدمت میں پیش ہے، اللہ تعالیٰ مفید تر فرمائے، حضرت والا کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے اور عزیز مرتب کے لیے ترقی کا ذریعہ فرمائے۔ آمین

بلال عبدالحی حسنی ندوی
مرکز الامام أبی الحسن الندوی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۴ر محرم الحرام ۱۴۴۲ھ

www.abulhasanalinadwi.org

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

عربی زبان میں دین کے معنی ہیں؛ زندگی کے طور وطریق کا اختیار کرنا، اسی کو اصطلاح میں مذہب بھی کہا جاتا ہے، اسلام میں زندگی کے متعلق جو ہدایات واحکام دیے جاتے ہیں، ان مقررہ قوانین کو شریعت کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، یہ احکام انسان کے لیے دنیا کی حقیر زندگی میں صحیح اور ضروری عمل کرنے کے لیے ہیں اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی دائمی زندگی کو پہچاننا آسان ہوتا ہے۔

اصطلاح کے دائرہ میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ جسم کے ظاہری اور اوپر پہنے جانے والے لباس کو جس طرح سے ہم ''دِثار'' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اندر کے جسم سے قریبی تعلق رکھنے والے لباس کو ''شعار'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اسی اصطلاح کو دین کے دائرہ میں لاکر قریبی اور ضروری کے معنی میں لیتے ہیں، زیادہ قریبی اور ضروری عمل کو ''شعار'' کہتے ہیں، اسی طرح جیسے عام اور ظاہری لباس کے مقابلہ میں اندر سے زیادہ تعلق رکھنے والے لباس کو شعار کہتے ہیں، اسی طرح دین کے اعمال میں زیادہ ضروری اور تقرب الٰہی کے عمل کو ''شعار'' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں، جس کی جمع ''شعائر'' ہے۔

ایسے احکام جن سے تقرب الٰہی کی زیادہ امید ہے، ان کو دوسرے اعمال کے مقابلہ میں شعائر کے لفظ سے ادا کرتے ہیں اور اس میں تقرب الٰہی کی زیادہ امید رکھتے ہیں اور یہ امید صرف اصطلاح کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سے اصلاً اللہ تعالیٰ کے

ہاں زیادہ مقبولیت کا وعدہ ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ کی طرف سے اپنی پسندیدگی ظاہر کی گئی ہے، خاص طور پر اس کے اجر کی مقدار میں، کیونکہ اس کے ساتھ اللہ نے اپنے نام کی نسبت بڑھائی ہے اور ان اعمال کی عظمت کو بڑھایا ہے۔

مثلاً: قرآن مجید کو اپنا کلام قرار دیا ہے، اس سے اس میں وہ طاقت پیدا کر دی کہ مضبوط پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتا، اجر میں ہر حرف پر نیکی رکھی۔

بیت اللہ شریف جہاں واقع ہے اس جگہ کو اپنے نام سے خصوصی تعلق بتا کر اس کا ثواب دوسرے علاقوں کے مقابلہ ایک لاکھ گنا کر دیا۔

حضور ﷺ کو آخری نبی اور خصوصی تقرب والا بنا کر اپنے عرش کے قریب تک بلایا اور سابقہ انبیاء سے ملاقات بھی کرادی اور آپ پر درود وسلام بھیجنے کو عبادت قرار دیا۔

زمین و آسمان کے مابین جو فرق ہے، دراصل یہ اس کا اثر بھی رکھنے والی بات ہے، زمین کو اللہ تعالیٰ نے حقیر ترین کی حیثیت دی ہے اور اس کے مقابلہ میں آسمان کو عظمت اور برتری کی حیثیت دی، اس کی وجہ سے زمین آسمان کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے، اسی لیے زمین آسمان کو براہ راست برداشت نہیں کر پاتی، سوائے اس کے کہ جس کو اللہ آسمان کی حیثیت دے دے، جیسا کہ گذشتہ مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

بیت اللہ شریف کو اپنا قرار دیے جانے پر وہ پورا آسمانی خصوصیات کا حامل بن جاتا ہے، زمین بہت چھوٹی اور کمزور شئی ہے، وہ زمینی مخلوقات کے زیر قدم رہتی ہے، اس کے مقابلہ میں آسمان چھت کی حیثیت رکھتا ہے اور بلند حیثیت کا ہوتا ہے۔

زمین کے حقیر ہونے کے باوجود اس میں اللہ نے ایک نمایاں صلاحیت رکھنے والی مخلوق انسان کو رکھا ہے، سب سے پہلے اس کو آسمان پر بنایا، لیکن اس کو زمین ہی پر اتار دیا کہ رہو زمین پر اور اپنی صلاحیت سے اوپر کی طرف بڑھو، لہٰذا جب یہ انسانی مخلوق آسمانی صفت اختیار کرتی ہے تو اونچی ہو جاتی ہے اور اس میں کوتاہی کرتی ہے تو اپنی زمینی حیثیت میں آجاتی ہے، اصلی اور حقیر دونوں کی طاقت میں بے حد فرق ہے، جیسا قرآن مجید کی مثال سے واضح ہے، لیکن زمین کے کسی جز کو آسمانی نسبت' اللہ کے

نام کی وجہ سے مل جاتی ہے، اس میں اس کو آسمانی فائدہ حاصل ہونے لگتا ہے، جس میں بطور مثال کعبۃ اللہ ہے اور عبادتوں میں خاص عبادت نماز ہے، یہ خصوصی شکل قرب الٰہی کی وجہ سے ہے، یہ دینی لحاظ سے شعار کا درجہ رکھتی ہے۔

دراصل انسان کے کمزور اور کمتر ہونے کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس پر خصوصی رحمت فرمائی کہ تمہارا وقت اور طاقت تو کم ہے، لیکن تم کو ہم بڑھانا چاہتے ہیں، لہٰذا ان راستوں سے تم بڑھ سکتے ہو اور اس طریقہ سے اپنے احسان سے انسان کو خصوصی طور پر نوازا، وہ اس کو پہلے سے ملنے والی بات تھی، لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے ایک کمزوری ظاہر ہوگئی تھی تو آسمانی عظمت تک جانے میں اور جنت تک جانے میں ہر ایک کو جانچ سے گذارا جارہا ہے کہ چند دن اپنے کو زمین سے اونچا کرنا ظاہر ہو اور آسمانی خصوصیت اختیار کی جاسکے تو آسمان کی طرف پرواز آسان ہوجائے۔

اس میں یہ شعائر جو اللہ کے نام کے اثر سے بڑا ذریعہ بنتے ہیں، ان سے انسان فائدہ اٹھائے، چار چیزوں کو اللہ نے آسمانی حیثیت دی ہے، قرآن مجید کے ذریعہ وہ مقام حاصل کیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی اتباع سے وہ شان حاصل کی جاسکتی ہے، اسی طرح بیت اللہ شریف کا حصہ آسمانی حیثیت کا حامل ہے اور نماز جو قرب الٰہی کا ایک بڑا ذریعہ ہے، اس کے ذریعہ سے انسان آسمانی نسبت حاصل کرسکتا ہے۔

میرے مختلف مضامین میں کئی جگہ ان مضامین کی طرف اشارے آتے ہیں، مرکز الامام أبی الحسن الندوی کے مدیر عزیزی مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے ان کو جمع اور مرتب کرنے کا مشورہ دیا اور الاخ مولوی محمد ارمغان ندوی نے ان کو جمع اور مرتب کرکے لائق فائدہ بنادیا، ان کے اس عمل سے اگر مجھ کو کچھ برکت ملے تو میرے لیے بڑی سعادت ہے۔ والحمد للّٰہ أولاً و آخراً

محمد رابع حسنی ندوی

دائرۂ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۵؍محرم الحرام ۱۴۴۲ھ

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شعائر اللہ کی عظمت - ایک مختصر تعارف

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ دنیا میں چار چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ شعار (شعائر اللہ) میں شامل ہیں، یعنی اس کی مخصوص چیزیں ہیں اور اللہ کی دنیا میں مخصوص چیزوں کا احترام اسی طرح کرنا چاہیے جیسا ان کا حق ہے، ان میں ایک قرآن مجید ہے، دوسرے کعبہ، تیسرے حضور ﷺ کی شخصیت اور چوتھے نماز:

"ومعظم شعائر اللّٰه أربعة: القرآن، والكعبة، والنبي، والصلاة."(۱)

(شعائر اللہ میں چار چیزیں شامل ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز)

اگر اللہ تعالیٰ کی ذات سے کسی بھی چیز کا تعلق ہو جائے تو وہ چیز بھی معظم و محترم ہو جاتی ہے، اس دنیا میں مندرجہ بالا چار چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے خاص ہے اور ان کو "شعائر اللّٰه" سمجھا جاتا ہے، اسی لیے ان کی عظمت بھی بڑھی ہوئی ہے۔

"شعیرۃ" عربی میں "شعار" سے ہے اور شعار اس کپڑے یا اس چیز کو کہتے ہیں جو ہر وقت انسان کے جسم سے لگی رہے، جیسے بنیائن، کرتا، پائجامہ، البتہ شیروانی یا کوٹ پہننا یا چادر اوڑھنا یہ اس سے الگ ہے، اس کو ضرورت پر استعمال کیا جاتا ہے، ہر وقت نہیں پہنا جاتا، لہٰذا جو لباس جسم سے بالکل وابستہ رہتا ہے اس کو عربی میں "شعار" کہا

(۱) حجة اللّٰه البالغة، المبحث الخامس، باب تعظيم شعائر اللّٰه تعالىٰ: ۱/ ۱٤٦

www.abulhasanalinadwi.org

جاتا ہے، اسی طرح دین کی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں وہ ''دینی شعائر'' میں شمار ہوتی ہیں، اسی لیے حج کی متعدد چیزوں کو شعائر کہا جاتا ہے اور ہر مسلمان پر شعائر کا احترام لازم ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (الحج:۳۲)

(اور جس نے شعائر اللہ کی تعظیم کی تو یقیناً یہ دل کے تقویٰ کی بات ہے)

تقوی کے معنی احتیاط و بچاؤ کے ہیں، آدمی کا اپنے کو گناہوں اور بری باتوں سے بچانا تقوی ہے، ہر بری بات، اللہ تعالیٰ کی معصیت اور جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، ان سے اپنے کو بچانا تقوی میں شامل ہے، معلوم ہوا اصل تقوی یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والی ہو، اس کا دل میں احترام ہونا چاہیے۔

پہلا شعار

شعائر اللہ میں جن چار عظیم چیزوں کا شمار ہوتا ہے، ان کے ساتھ بہت اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، اور ان سے اپنا تعلق بہت ہی مخلصانہ اور اچھی نیت سے قائم کرنے کی ضرورت ہے، قرآن مجید چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے، اس لیے یہ عظیم شعائر میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو انسانوں کی توجہ خالق حقیقی کی طرف مبذول کرانے کے لیے نازل فرمایا، قرآن مجید میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کیا معاملہ اور تعلقات ہونا چاہئیں، قرآنی تعلیمات انسانی زندگی کو سیدھے راستہ کی رہنمائی کرتی ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يِهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾ (بنی اسرائیل: ۹)

(بلاشبہ یہ قرآن اس راستہ پر لے جاتا ہے جو بالکل سیدھا ہے)

دوسرا شعار

کعبۃ اللہ بھی شعائر اللہ میں ہے، کیونکہ وہاں ہمہ وقت انوار الٰہی کی بارش ہوتی ہے اور اس گھر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے، اس کو ''بیت اللہ'' یعنی اللہ کا گھر کہا جاتا ہے، لہٰذا اس کا بھی احترام و تعظیم اور اس سے قرب کو اپنے لیے ترقی و فلاح کا ذریعہ سمجھنا ضروری ہے، بیت اللہ کا احترام یہ ہے کہ بیت اللہ کا طواف کیا جائے، کیونکہ وہاں طواف نفل سے زیادہ افضل چیز ہے اور اگر کوئی شخص طواف نہ بھی کرے تو صرف بیٹھ کر بیت اللہ کو دیکھتا ہی رہے، اپنی آنکھوں کو اس سے لگاتا رہے، یہ بھی اس کا احترام ہے اور اس سے بھی انسان کی روحانی ترقی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کعبہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بتایا:

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً﴾ (البقرۃ: ۱۲۵)

(اور جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ مقرر کیا)

تیسرا شعار

حضور ﷺ کی تعظیم بھی شعائر اللہ میں ہے، کیونکہ آپ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا ہے:

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (آل عمران: ۳۱)

(اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا، اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والا نہایت رحم والا ہے)

اس آیت سے حضور ﷺ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ایک دوسری

جگہ پر مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی فرمادیا گیا دیا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب: ٢١)

(اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے)

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے انسان کامل بنایا، جیسے کوئی ماڈل یا نمونہ ہوتا ہے اس کو دیکھ کر آدمی چیز کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور غور کرتا ہے کہ کس طرح اس کی نقل کی جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسان کا اعلیٰ نمونہ بنایا، انسان اگر بہتر سے بہتر انسان بننا چاہتا ہے تو وہ حضور ﷺ کی نقل کرے، آپ کے طریقہ کو اختیار کرے، آپ کی سنت پر عمل کرے تو وہ اللہ کے یہاں محبوب ہوجائے گا، مقرب ہوجائے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخصیت کو اپنے ساتھ مخصوص کرلیا ہے۔

حضور ﷺ اگر چہ انسان تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نبی بھی تھے اور نبی کی نگرانی اور اس کی سرپرستی براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اس لیے نبی کی غلطی غلطی نہیں رہتی، اگر نبی سے جلدی میں کوئی غلط فیصلہ ہوجائے جو خاص اسی کی رائے سے ہو تو فوراً اوپر سے توجہ دلادی جاتی ہے کہ یہ غلط ہے تم اس کو اس طرح کرو، گویا نبی کو اللہ کی پوری سرپرستی حاصل ہوتی ہے، اسی لیے نبی سے غلطی نہیں ہوتی۔

چوتھا شعار

شعائر اللہ میں چوتھی چیز نماز ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں ایمان کی بات فرمائی ہے، وہاں نماز کا ذکر بھی آیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الروم: ٣١)

(اور تم نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہوجاؤ)

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ نماز کو ذکر کے ساتھ وابستہ کردیا گیا ہے:

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طه: ١٤)

(اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو)

ایک حدیث میں نماز کے تعلق سے ارشاد ہے:

"بين الرجل و بين الشرك و الكفر ترك الصلاة."(١)

(مؤمن) بندے اور شرک وکفر کے درمیان فرق نماز کا چھوڑنا ہے)

یعنی مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہے، گویا ایک طریقہ سے یہ بات کہہ دی گئی کہ نماز وہی چھوڑتا ہے جو کافر ہے، مسلمان نماز چھوڑ ہی نہیں سکتا، یہ اس کی شان کے خلاف بات ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا خاص تعلق ہے۔

ایک جگہ یہ بھی آتا ہے:

"الصلاة معراج المؤمن"(٢) (نماز مؤمن کی معراج ہے)

یعنی نماز اللہ کے دربار میں انسان کی حاضری ہے، نماز کے ذریعہ سے اللہ سے اس کا قریبی تعلق قائم ہوجاتا ہے، جس طرح انسان بادشاہ کے دربار میں سامنے جاکر کھڑا ہوجاتا ہے، اب اگر کسی کو نماز کے ذریعہ اس کے دربار میں پہنچنے کی کیفیت حاصل ہوجائے تو اس کو کتنا مزہ آئے، حکم کی تعمیل اپنی جگہ پر ہے، لیکن یہ اس شخص کے لیے کتنے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے دربار میں باریابی کا شرف عطا فرمایا، لیکن یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہے جب انسان اس کو اسی طرح سمجھے، کیونکہ آدمی کے خود سمجھنے پر ہی سارا انحصار ہے۔

آئندہ صفحات میں شعائر اللہ میں شامل انہیں چار چیزوں کا قدرے تفصیل سے ذکر ہے:

---

(١) مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة: ٢٥٦

(٢) شرح سنن ابن ماجة للسيوطي، كتاب الطهارة، باب ذكر التوبة: ٤٢٣٩

www.abulhasanalinadwi.org

قرآن مجید کی عظمت

کلام الٰہی کی عظمت ومقبولیت

قرآن مجید کی عظمت ومقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید کی عظمت اور بزرگی اور اس کی فضیلت اور رفعت کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ وہ خداوند عالم خالق لوح وقلم کا کلام ہے، تمام عیوب و نقائص سے بری اور پاک ہے، فصاحت و بلاغت اس کی تمام عرب نے مان لی، بڑے بڑے فصاحت و بلاغت کے مدعی اس کے مثل دو تین فقرے بھی صدہا برس کی کوششوں میں نہ بنا سکے، برسر مجمع اعلان بھی کیا گیا، جوش دلانے والے خطاب سے کہا گیا کہ اگر تم اس کے کلام خدا ہونے میں شک کرتے ہو اور اس کو کلام بشر سمجھتے ہو تو تم اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مثل کوئی عبارت بنالاؤ اور تمام اعوان و انصار کو جمع کرو، ہرگز نہ بنا سکو گے، قوم جن نے جب اس کلام معجز نظام کو سنا، بے ساختہ کہہ اٹھے کہ

﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآناً عَجَباً☆يَهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَداً﴾ (الجن: ۱-۲)

(بے شک ہم نے ایک عجیب قرآن سنا جو نیکی کی طرف ہدایت کرتا ہے، ہم

اس پر ایمان لائے اور اپنے پروردگار کا کسی کو شریک ہرگز نہ سمجھیں گے)
خود اللہ جل شانہ اس مقدس کلام کی تعریف فرماتا ہے پھر ہم لوگوں کی زبان وقلم میں کیا طاقت ہے کہ اس کے اوصاف وفضائل کا ایک شمہ بھی بیان کرسکیں۔

اس کی تلاوت اور پڑھنے پڑھانے کا ثواب محتاج بیان نہیں، تمام علماء امت متفق ہیں کہ کوئی ذکر، تلاوت قرآن مجید سے زیادہ ثواب نہیں رکھتا، احادیث اس باب میں بیش از بیش ہیں، نمونے کے لیے تبرکا چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کوئی قرآن مجید کے پڑھنے میں مشغول ہو اور دعا یا کسی دوسرے ذکر کی اس کو فرصت نہ ملے، میں اس کو دعا مانگنے والوں سے بھی زیادہ دوں گا اور کلام اللہ کی بزرگی تمام کلاموں پر ایسی ہے جیسے خدا کی بزرگی تمام مخلوق پر۔(۱)

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے، تمام آسمانوں اور زمینوں اور ان جیسی چیزوں سے جو اس میں ہیں۔(۲)

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر قرآن مجید کسی کھال میں ہو تو وہ کھال آگ میں نہیں جل سکتی۔(۳)

کھال سے مراد قلب مؤمن ہے کہ اگر اس میں قرآن مجید ہو تو عذاب دوزخ سے محفوظ رہے گا۔

☆ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ تین قسم کے لوگوں کو قیامت میں خوف

(۱)الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل کلام اللّٰہ علی سائر الکلام: ۳٤۱۹
(۲)سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب القرآن کلام اللّٰہ: ۳٤۱٦
(۳)سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من قرأ القرآن:۳۳۷۳

www.abulhasanalinadwi.org

نہ ہوگا، نہ ان سے حساب لیا جائے گا اور تین میں سے قرآن مجید پڑھنے والے کو آپ ﷺ نے بیان فرمایا۔(۱)

☆ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اے لوگو! میں بھی ایک آدمی ہوں، قریب ہے کہ میرے پروردگار کی طرف سے کوئی مجھ کو بلانے آئے اور میں چلا جاؤں، میں تم میں دو گراں قیمت اور بزرگ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک خدا کی مقدس کتاب، اس میں ہدایت اور نور ہے، پس تم لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑ لو اور اس پر عمل کرو۔ (راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ نے لوگوں کو اس پر بہت رغبت دلائی) دوسرے میرے اہل بیت ہیں، تم کو خدا کا خوف یاد دلاتا ہوں، اپنے اہل بیت کی رعایت حقوق میں۔''(۲)(۳)

کلام الٰہی کی طاقت

قرآن مجید سے بندہ کا تعلق قائم ہونا ایک نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے فائدہ اٹھانا سعادت کی بات ہے، اس لیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور براہ راست اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے، اس کی طاقت، اس کی خصوصیت، اس کا اثر بے انتہا ہے، اس کا اثر ایسا ہے کہ اگر یہ اپنے صحیح اثر کے ساتھ اس دنیا میں ظاہر ہو جائے تو دنیا اس کو برداشت نہیں کر سکتی، قرآن میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَـٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾

(الحشر: ۲۱)

---

(۱)سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من قرأ القرآن:۳۳۹۲

(۲)سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من قرأ القرآن:۳۳۷۹

(۳)از؛ بیان القرآن، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

www.abulhasanalinadwi.org

(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے رعب سے دبا جارہا ہے، پھٹا پڑتا ہے اور یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے سامنے اس لیے دیتے ہیں تاکہ وہ سوچیں)

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال بھی پیش کی گئی کہ جب انہوں نے اپنے رب کے حضور تجلی کی درخواست کی تو ارشاد ہوا:

﴿وَلَمَّا جَاءَ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا﴾

(الأعراف: ١٤٣)

(اور جب موسیٰ ہماری (طے کردہ) مدت پر پہنچ گئے اور ان کے رب نے ان سے کلام فرمایا، وہ بولے اے میرے رب! تو مجھے دیدار کرادے کہ میں تجھے دیکھ لوں، فرمایا: تم مجھے دیکھ نہیں سکتے، البتہ پہاڑ کو دیکھو پھر اگر وہ اپنی جگہ سلامت رہ گیا تو آگے تم مجھے دیکھ لوگے، پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اس نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے)

کلام الٰہی کی تجلی اور اس کی غیر معمولی طاقت کا اندازہ احادیث میں مذکور اُن واقعات سے بھی ہوتا ہے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نزول وحی کے وقت پسینہ سے شرابور ہوجاتے تھے اور خود پر بہت بوجھ محسوس کرتے تھے، جب کہ آپ ﷺ کو اللہ نے ہر حیثیت سے مکمل بنایا تھا، حضرت زید بن ثابتؓ کی شہادت ہے:

"أنزل الله على رسوله -صلى الله عليه وسلم- وفخذه على فخذى فثقلت علي حتى خفت أن ترض فخذى."(١)

(١)صحيح البخارى، كتاب الصلاة، باب ما يذكر فى الفخذ: ١٢

www.abulhasanalinadwi.org

(اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی نازل فرمائی تو آپ کی ران میری ران پر تھی، مجھے اتنا بوجھ لگا کہ اندیشہ ہوا کہ کہیں میری ران ٹوٹ نہ جائے۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شدید سردی کے ایام میں نزول وحی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"لقد رأيته ينزل عليه الوحي في اليوم الشديد البرد فيفصم عنه وإن جبينه ليتفصد عرقا."(۱)

(میں نے شدید سردی کے دن نزول وحی کی کیفیت دیکھی ہے، (اس روز) جب فرشتہ آپ سے جدا ہوا تو (شدید سردی کے باوجود) آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔)

ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ ﷺ سواری پر ہوتے اور وحی نازل ہوجاتی تو سواری بوجھ کی شدت سے بیٹھ جاتی:

"إن كان ليوحى إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو على ناقته فتضرب على جرانها من ثقل ما يوحى إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وإن كان جبينه ليطف بالعرق في اليوم الشاتي."(۲)

(اگر آپ ﷺ پر اس حالت میں وحی آتی کہ آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے تو وحی کے بوجھ سے اونٹنی بیٹھ جاتی اور سردی کے موسم میں بھی آپ کی پیشانی سے پسینہ رواں ہوجاتا۔)

مذکورہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کلام الٰہی کا تحمل براہ راست عام انسانوں کے لیے آسان نہ تھا، اسی لیے مختلف مراحل سے گزر کر یہ کلام تمام انسانوں تک پہنچا۔

---

(۱)صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب....: ۲

(۲)دلائل النبوة للبيهقي، أبواب غزوة تبوك، كيفية نزول الوحي...: ۹۹/۸

www.abulhasanalinadwi.org

کلام الٰہی کی مثال

اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے کلام کو ایسا کر دیا کہ وہ کلام زمین پر رہ سکے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ ہوتا ہے جو تار سے گزرتا ہے اور اس کے اوپر ربڑ چڑھی ہوتی ہے، اگر اس ربڑ کے ساتھ کوئی شخص بجلی کا تار پکڑے یا اسے استعمال کرے تو اس سے روشنی حاصل ہوگی، ہوا ملے گی، ٹھنڈک اور گرمی ملے گی اور بڑی بڑی مشینیں بھی اس سے چلائی جاسکیں گی، لیکن اگر کوئی ربڑ کے بغیر کھلا تار چھولے تو اسے بجلی کا ایسا کرنٹ لگے گا کہ اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی، لیکن اگر انسان وہی کرنٹ بالواسطہ چھوتا ہے تو اس کو برداشت کر لیتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے، البتہ براہ راست اس کو نہ چھوا جاسکتا ہے، نہ ہلایا جاسکتا ہے، نہ ہی اس پر ہاتھ رکھا جاسکتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن مجید کی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو عربی الفاظ کی شکل میں ایسا روحانی غلاف عطا فرمایا کہ یہ ہمارے کانوں میں بھی جاتا ہے، ہمارے منھ سے بھی ادا ہوتا ہے، اس کو ہم کاغذ پر بھی لکھ لیتے ہیں، اس کو ہاتھوں میں بھی اٹھا لیتے ہیں، ورنہ اگر یہ کلام اپنے روحانی غلاف میں نہ ہو، یا ہم عربی الفاظ کے اندر پنہاں خدا تعالیٰ کے کلام کی جلالت شان سے صحیح معنی میں ادنی درجہ بھی واقف ہو جائیں تو ہم اس کی تاب نہیں لا سکتے اور یہ کلام اس دنیا میں اتر نہیں سکتا اور دنیا اس کو جھیل نہیں سکتی، بلکہ دنیا پھٹ جائے گی، ٹوٹ جائے گی، اس لیے کہ ہم روحانی اعتبار سے اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتے جو کلام الٰہی کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

گویا یہ اللہ کا ایسا فضل ہے کہ وہ چیز جس کو ہم برداشت نہیں کر سکتے وہ ہم کو عطا فرمائی، جو چیز اس زمین میں رہ نہیں سکتی تھی اللہ نے اس کو اتارا، تاکہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ اتنی بڑی دولت و نعمت دی ہے جو ہمیں

عام حالات سے نہیں مل سکتی تھی، لہٰذا اس کی قدر کرنے کی ضرورت ہے، انسان اس کی جتنی زیادہ قدر کرے وہ کم ہے۔

زمین آسمان کا فرق

قرآن مجید آسمانی کتاب ہے اور یہ زمین آسمان کے درجہ کی نہیں ہے، زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے، اس لیے آسمان کو یہ زمین برداشت نہیں کرسکتی، آسمان کی جو طاقت اور وزن ہے اس کے سامنے زمین کوئی حیثیت نہیں رکھتی، کائنات کے دوسرے سیاروں کے مقابلہ میں بھی زمین کی طاقت اور وزن بہت کم ہے، گرچہ ہر سیارہ کا اپنا الگ الگ کام ہے، بطور مثال سورج کو لے لیا جائے تو سورج کے سامنے زمین کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ سورج زمین سے غیر معمولی فاصلہ پر ہے، مگر پھر بھی وہ زمین کو تپا دیتا ہے اور زمین اسی کے گرد گردش کرتی رہتی ہے، وہ بھاگ نہیں پاتی، گویا اس اعتبار سے زمین کی کوئی حیثیت وحقیقت نہیں ہے۔

غور کا مقام ہے کہ اللہ کا کلام جو ایک تجلی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر وہ اس زمین پر کیسے آسکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر یہ کرم فرمایا کہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اپنے کلام کو زمین پر بھیجا اور وہ انتظامات فرمادیئے کہ جن کی وجہ سے یہ کلام زمین پر رہ سکے اور لوگ اس کو پڑھ سکیں، ورنہ اگر یہ کلام اپنی اسی طاقت کے ساتھ ہو یعنی اسی کیفیت کے ساتھ ہو جو اس کی اصل کیفیت ہے تو اس کو آدمی اپنی زبان سے ادا نہیں کرسکے گا اور اس کو سن نہیں سکے گا اور اس کلام کو انسان کے کان برداشت نہیں کرسکیں گے، بلکہ اس کی تجلی اثر انداز ہوگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَـٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ (الحشر: ۲۱)

(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے

رعب سے دبا جارہا ہے، پھٹا پڑتا ہے)

لیکن قرآن مجید کا نزول انسانوں کی ہدایت کے لیے ہوا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيَ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ﴾ (البقرة: ١٨٥)

(رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں راہ یابی اور (حق و باطل میں) امتیاز کی کھلی نشانیاں ہیں)

نزول قرآن کا مقصد

قرآن مجید کا نزول مختلف مراحل میں ہوا ہے، پہلی مرتبہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول ہوا اور آسمان دنیا سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ وقتاً فوقتاً آپ ﷺ کی ذات اقدس پر قرآنی آیات کا نزول ہوتا رہا۔ اتنے واسطوں سے قرآن مجید کا نزول محض ہمارے فائدے کے لیے ہوا، تاکہ ہم اس سے نصیحت حاصل کریں، اپنی زندگی کو بنائیں اور سنواریں، اپنی زندگی کو اسی کے مطابق ڈھالیں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل: ٤٤)

(اور (کتاب) نصیحت آپ پر اس لیے اتاری تاکہ آپ لوگوں کے لیے چیزوں کو کھول دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں اور شاید وہ غور کریں)

نزول قرآن کی حکمت

حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام نازل فرمایا اور اس کی حکمت یہ بیان کی گئی کہ اس سے تمام لوگ نصیحت حاصل کریں، غور کریں اور سمجھیں کہ ان کی کیا ذمہ داری ہے اور اس دنیا میں ان کو کس طرح رہنا چاہیے؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام انسانوں کے حالات کا ذکر ہے، یعنی لوگوں کے جو مختلف حالات

ہوسکتے ہیں، اچھے اور برے شخص کے، منافق ومخلص انسان کے، بدمعاش اور خوش اخلاق شخص کے، غرض کہ انسانوں کی جو مختلف صفات ہوسکتی ہیں، ان سب کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وضاحت کی ہے، گویا ہر ایک کی زندگی اور حالات کا اس میں پورا تذکرہ رکھا گیا ہے، اسی لیے ایک جگہ فرمایا کہ کیا تم اس کا مطالعہ کرکے عقل سے کام نہیں لیتے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (الأنبياء: ۱۰)

(بلاشبہ ہم نے تم پر ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے بھلا تم سمجھ سے کام کیوں نہیں لیتے)

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ہر شخص کو اپنے حالات پر غور کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کو کس نے پیدا کیا؟ ہم کو کس نے یہ سب نعمتیں دیں؟ جن کو ہم خود سے کبھی بھی حاصل نہیں کرسکتے تھے، نہ خود سے ہم ہر چیز پر قادر تھے۔

قرآن مجید کی قدر

قرآن مجید کی قدر کے متعلق ایک آیت کا ذکر ہی کافی ہے جو متعدد جگہ ہے:

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (شاید وہ سمجھ سکیں، غور کرسکیں)

یعنی بندے یہ سمجھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقام کیا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کی کیا حیثیت ہے اور ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ انہیں کیسی زندگی گزارنی چاہیے؟ ان کے اعمال کیسے ہونے چاہئیں؟ ان کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ ان کے دل کے اندر کیا کیفیات اور جذبات ہونا چاہئیں؟

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بے شمار احسانات کیے ہیں، یہ دنیا ہمارے لیے بنائی، ہمارے لیے ہی سورج کو مسخر کیا، چاند کو ہمارے لیے مفید بنایا، اسی طرح زمین میں جو کچھ ہوتا ہے اور جو کچھ پایا جاتا ہے وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے فائدے کے

لیے رکھا کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، غرض کہ ہر طرح کی نعمتیں جن کی ہم کو زندگی میں ضرورت ہے، وہ سب اللہ نے ہمارے لیے مہیا کیں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾

(ابراهيم: ٣٤)

(اور جو تم نے مانگا وہ اس نے تمہیں دیا اور اگر تم اللہ کی نعمت کا شمار کرنے لگ جاؤ تو تم اس کو گن نہیں سکتے)

اللہ تعالیٰ ان سب نعمتوں سے نوازنے کے بعد چاہتا ہے کہ بندہ اُسی کی بات کو مانے اور اپنے پروردگار کے سامنے اپنے کو بندہ بنا کر رکھے، اپنے پروردگار کا مقابلہ نہ کرنے لگے، یعنی اپنے کو اپنے پروردگار کے برابر سمجھنے لگے، وہ اس طرح کہ اپنے نفس کے مطابق عمل کرے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کر دے، یا جس طرح اپنے ساتھی کے ساتھ رویہ ہوتا ہے وہی رویہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختیار کرے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ جو کہہ رہا ہے وہ نہیں کرتا، یعنی اپنے کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھ رہا ہے، یا کسی اور ذات کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھ رہا ہے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت ہی ناپسندیدہ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ایسے شخص کو ''ظالم'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جو احکامات الٰہیہ کو پس پشت ڈال دیتا ہو اور اپنے رب کی طرف رجوع کی اسے کوئی پرواہ نہ ہو، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ﴾ (السجدة: ٢٢)

(اور اس سے بڑھ کر ناانصاف کون ہوگا جس کو آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جائے پھر وہ ان سے پہلو تہی کرے، ہم ایسے مجرموں سے انتقام لے کر رہیں گے)

اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کو سب کچھ عطا فرمایا، حتی کہ زمین پر اس کی خاطر اپنا کلام اتار دیا جو اتر نہیں سکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اسی لیے اتارا تا کہ ہم اس سے صحیح راہ پر آسکیں، اس لیے اس کلام کی قیمت کو سمجھنا چاہیے اور اس کا جو ادب اور مقام ہے اس مقام کی قدر دانی جیسی کرنی چاہیے وہ بھی انتہائی ضروری ہے۔

آدابِ قرآنی

قرآن مجید کا ادب خود قرآن کریم کی زبانی یہ ہے کہ:

﴿لَا يَمَسُّهٗٓ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ (الواقعة: ۷۹)

(اس کو نہیں چھوتے مگر وہ لوگ جو پاکیزہ ہوتے ہیں)

یوں تو انسان مکمل طور پر پاک ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ نہ جانے اس کے پیٹ میں کیا کیا بھرا ہوا ہے، لیکن ظاہری طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو ایسا طریقہ بتادیا کہ اگر اس کو اختیار کرلیا جائے تو انسان کو پاک سمجھ لیا جائے گا، اب ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس پاکی کے طریقہ کو اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا پاک کلام پڑھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ احسان سمجھے کہ اس نے ہمیں اس قابل بنادیا کہ ایک ناپاک انسان اللہ کے پاک کلام سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

آداب قرآنی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان قرآن مجید کی قدر دانی میں کوتاہی سے کام نہ لے، ہم قرآن مجید کی جتنی قدر کرسکتے ہیں ہمیں کرنی چاہیے۔ قرآن مجید کی قدر دانی سے ظاہری طور پر ادب ولحاظ رکھنے کے علاوہ یہ بات بھی مراد ہے کہ قرآن مجید میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں اور ان سے ہماری زندگی کی جو رہنمائی ہوتی ہے اس سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہیے، ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، کیونکہ اس کلام کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی زندگی کو سنواریں، جب ہم ایسا کریں گے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوگی

اور ہماری یہ ادا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آئے گی کہ اس کا بندہ اس کی اطاعت کر رہا ہے، اس کے کہنے پر چل رہا ہے اور اس نے جو ہدایات دی ہیں ان کو مان رہا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس کی ترغیب بھی دلائی گئی ہے، ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (الزمر: ۵۵)

(اور اپنے رب کے پاس سے اتری اچھی باتوں پر چلو)

دنیاوی واخروی نظام

دنیاوی اور اخروی نظام کے فرق کو سمجھنا چاہیے، دنیا کا نظام مٹی والا نظام ہے کہ اگر ہم یہاں بیج بوتے ہیں تو کھیتی ہوتی ہے، پودا لگاتے ہیں تو درخت اگتا ہے، اینٹ سے اینٹ جوڑتے ہیں تو عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اخروی زندگی میں یہ نظام نہیں چلتا، بلکہ وہاں کا نظام روحانی ہے، جہاں کسی بھی چیز کے حصول کے لیے ہمیں دنیوی زندگی میں کیے گئے نیک عمل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر اخروی زندگی میں ہمیں باغات چاہیے، محل اور نہریں چاہئیں تو اس کے لیے ظاہری اسباب سے ہٹ کر ان اعمال کی ضرورت ہوگی جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اور نبی اکرم ﷺ نے تفصیل سے موقع بموقع بیان فرمایا ہے۔

قرآنی تعلیمات پر عمل کا نتیجہ

قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے اور احکامات الٰہیہ کی اتباع کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کو آسمانی طاقت حاصل ہوگی جو ہمیں آخرت کی زندگی میں کام دے گی، اس لیے کہ وہاں کی زندگی میں ہمارا ایمان اور ہمارے نیک کام ہی ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں، انہیں کے ذریعہ وہاں کی زندگی میں ہم کو ایسی بیش بہا نعمتوں کا استحقاق ہوسکتا ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي

مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤاً وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ﴾ (الحج: ۲۳)

(بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے، ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتی سے سجایا جائے گا اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا)

قرآنی آیات کے علاوہ مختلف احادیث کے مضامین سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ آخرت کی زندگی بالکل چٹیل میدان کی طرح ہے، جہاں انسان کو کسی بھی قسم کی راحت کا سامان حاصل کرنے کے لیے دنیاوی زندگی میں ایسے اعمال کرنا ہوں گے، جن سے وہاں کی زندگی میں اس کی ضروریات کی تکمیل ممکن ہو سکے اور وہ مشکلات اور پریشانیوں سے محفوظ رہ سکے، ایک حدیث میں ہے:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لقيت ابراهيم ليلة أسري بي، فقال: يا محمد! أقرئ أمتك مني السلام وأخبرهم أن الجنة طيبة التربة، عذبة الماء، وأنها قيعان، غراسها؛ سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر."(۱)

(حضور ﷺ کا ارشاد ہے: شب معراج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا: اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہنا اور انہیں بتانا کہ جنت کی مٹی خوشبودار ہے، اس کا پانی میٹھا ہے اور جنت ایک چٹیل میدان ہے، جس میں "سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر" کہنے سے درخت لگتے ہیں۔)

ایک دوسری حدیث میں ذکر ہے کہ انسان دنیا میں ایک معمولی کلمہ اپنی زبان

(۱) سنن الترمذی، أبواب الدعوات، باب غرس الجنة...: ۳۷۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

سے ادا کرتا ہے اور آخرت کی زندگی میں اس کے لیے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے:

”من قال سبحان اللّٰہ العظیم وبحمدہ غرست لہ نخلة فی الجنة.“(۱)

(جو شخص ”سبحان اللّٰہ العظیم وبحمدہ“ کہے تو اس کے لیے جنت میں کھجور کا ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔)

ایک اور حدیث میں ذکر ہے کہ اگر بندہ یہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کے لیے جنت میں ایک باغ لگا دیا جاتا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

”ما من مسلم یعود مسلما غدوة إلا صلی علیه سبعون ألف ملك حتی یمسي وإن عاده عشیة إلا صلی علیه سبعون ألف ملك حتی یصبح وکان له خریف فی الجنة.“(۲)

(جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے صبح کو جاتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اگر وہ شام کو عیادت کے لیے جاتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور اس کے لیے جنت میں ایک باغ لگا دیا جاتا ہے۔)

سنن ترمذی ہی کی ایک روایت میں ذکر ہے کہ جنت کے بالا خانے ان لوگوں کے لیے ہوں گے، جنھوں نے دنیاوی زندگی میں نیک اعمال کیے ہوں، فرمایا:

”إن فی الجنة لغرفا یری ظهورها من بطونها وبطونها من ظهورها، فقام إلیه أعرابي، فقال: لمن هي یا رسول اللّٰه! قال: هي لمن أطاب الکلام وأطعم الطعام وأدام الصیام وصلی للّٰه باللیل والناس نیام“(۳)

(۱)سنن الترمذی، أبواب الدعوات، باب من قال سبحان اللّٰه...: ۳۸۰۰

(۲)سنن الترمذی، أبواب الجنائز، باب ما جاء فی عیادة المریض: ۹۸۵

(۳)سنن الترمذی، أبواب صفة الجنة، باب ما جاء فی صفة غرف الجنة: ۲۷۱۸

www.abulhasanalinadwi.org

(جنت میں ایسے بالا خانے ہیں جن کے اندر کا باہر سے اور باہر کا اندر سے سب کچھ صاف نظر آتا ہے، ایک اعرابی نے کھڑے ہوکر سوال کیا؛ اے اللہ کے رسول! یہ بالا خانے کن لوگوں کے لیے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اچھی بات کرے، دوسروں کو کھانا کھلائے، روزوں کا پابند ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے راتوں کو نماز ادا کرے، جب لوگ سو رہے ہوں)

اخروی زندگی میں جنت کے باغات، بالا خانے، سایہ دار درخت اور نہریں یا جو بھی وہاں کی خاص نعمتیں ہیں، ان کے حصول کی خاطر ضروری ہے کہ ہم دنیوی زندگی میں وہ اعمال کریں جن کا ہم سے مطالبہ ہے اور ان اعمال سے مراد وہی اعمال ہیں جن کو ہمارے فائدے کے لیے قرآن وحدیث کے ذریعہ سے ہم کو بتادیا گیا ہے کہ اگر تم دنیوی زندگی میں یہ عمل کروگے تو اخروی زندگی میں تم کو یہ فائدہ ہوگا اور اگر تم یہ عمل نہیں کروگے تو جب تم آخرت میں جاؤگے تو تمہیں وہاں اپنے لیے ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہیں ملے گا، جہاں تمہارے لیے نہ کوئی سایہ ہوگا، نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو، گویا جیسے پتھر ہوتا ہے، اس پر آپ کھڑے رہیے تو آپ کو نہ سایہ حاصل ہوگا اور نہ ہی آپ کو راحت ملے گی۔

انسانی مخلوق کا امتیاز

اللہ تعالیٰ نے جو مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، ان تمام مخلوقات کی نوعیتیں الگ الگ ہیں، ان سب کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت رکھی ہے ان میں وہی صلاحیت موجود ہے، وہ اپنی اس صلاحیت سے نہیں ہٹ پاتے، دوسری بات یہ ہے کہ ان کو موہوب صلاحیت کے سوا مزید معلومات حاصل کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے، اسی لیے ان سب کا دائرہ محدود ہے اور ہر مخلوق کو من جانب اللہ جو ذمہ داری تفویض کی گئی ہے، وہ اپنی اسی

ذمہ داری کی ادائیگی میں مصروف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں انسانی مخلوق کو ایسا بنایا ہے کہ ان کو زندگی گذارنے کے لیے معلومات سے واقفیت بہت ضروری ہے اور اگر ان کے پاس معلومات نہ ہوں تو ان کی زندگی بالکل بے کار ہے، مثلاً:

اگر آپ کو نہ معلوم ہو کہ کپڑا کیسے بنتا ہے؟ کپڑا کہاں سے لایا جاتا ہے؟ غذا کہاں اور کیسے ملے گی؟ پانی کیسے حاصل ہوگا؟ یا آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں پانی نہ ہو، غذا کا بھی کوئی انتظام نہ ہو یا وہاں کی زمین ہی ایسی ہو کہ وہاں کچھ نہ ملتا ہو اور آپ کو وہاں کے متعلق کچھ معلوم بھی نہ ہو تو ایسی صورت حال میں آپ کہاں سے کھانا لائیں گے؟ کہاں سے پانی لائیں گے؟ کہاں سے کپڑے لائیں گے؟ ظاہر ہے ایسے موقع پر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

معلوم ہوا انسان کی زندگی کا پورا نظام معلومات پر چل رہا ہے، معلومات کے ذریعہ سے ہی آدمی اپنی ضروریات اور اپنے تقاضے اور اپنا مقصد سمجھتا ہے، گویا معلومات بنیادی چیز ہے جس سے انسان اس دنیا میں زندہ ہے اور تمام مخلوقات پر اس کا تفوق ثابت ہے، ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

انسان اور دیگر مخلوقات کا فرق

انسان اور جانور کی زندگی کا فرق اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کو ایک وقت کے کھانے کے لیے بہت سی معلومات سے واقفیت ضروری ہوتی ہے، اس کو یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ایک وقت کے کھانے کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں گے جن سے اس کے ہاتھ میں پیسہ آسکے، پھر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے ذوق کے مطابق کھانے پینے کی اشیاء کہاں ملیں گی، پھر انہیں بنانے کا طریقہ معلوم کرتا ہے اور اس کے بعد عمدگی کے ساتھ پکا کر اطمینان سے کھاتا ہے۔

لیکن ایک جانور ہے جس کو کھانے کے لیے کسی قسم کی معلومات یا کوئی ذریعہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ذریعہ اختیار کرنا اس کے بس میں ہے، کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا، لہٰذا اس کو جب بھوک لگے گی تو وہ جہاں کھانے کی کوئی چیز دیکھے گا کھالے گا، جب پیاس لگے گی تو جہاں پانی دیکھے گا پی لے گا، تاہم اس کو یہ سب کچھ نہیں معلوم کہ پانی کیسے ملتا ہے؟ کھانے کے لیے پتے کیسے حاصل ہوتے ہیں اور زمین سے گھاس کیسے پیدا ہوتی ہے؟

اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق فرشتے بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص اپنا تابع دار بنایا ہے، وہ اپنی رائے اور اپنے خیال سے کچھ نہیں کر سکتے، بلکہ ان کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے اور جو کام ان کے سپرد ہے، وہ صرف وہی کام کر سکتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (التحریم: ٦)

(وہ (فرشتے) اللہ کے کسی حکم کی سرتابی نہیں کرتے اور ان سے جو کہا جاتا ہے وہ کیے جاتے ہیں)

انسان کی ممتاز صفات کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو علم کے ذریعہ سے ممتاز بنایا ہے، اس نے انسان کو دنیوی زندگی کی معلومات کے ساتھ اخروی زندگی کی معلومات بھی عطا فرمائیں، جس کی خاطر اس نے نبیوں کو بھیجا اور آسمان سے کتابیں نازل فرمائیں اور اخیر میں قرآن مجید جیسی مبارک کتاب کا تحفہ انسانیت کی نذر کیا، تاکہ انسان دونوں جہان کی سہولیات سے فائدہ اٹھا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیاوی معلومات اس لیے دیں کہ ان سے انسانی زندگی کی ضروریات پوری ہوں، پانی کہاں سے لایا جائے؟ غذا کہاں سے حاصل ہو؟ کپڑا کہاں سے لایا جائے؟ مکان کیسے بنایا جائے؟ غرض کہ ان تمام ضروریات کو دنیوی

معلومات سے پورا کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔

اس کے علاوہ اخروی زندگی کے متعلق جو معلومات دی ہیں، ان کا مقصود یہ ہے کہ انسان ان تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی کو سنوارے، اپنے خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، تاکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوازا جائے اور وہاں کی ساری سہولیات مہیا ہوسکیں، جس کی ضرورت ہمیں اخروی زندگی میں ہوگی۔

مادی ومعنوی نظام کا فرق

اخروی زندگی میں ایسا نظام نہیں ہوگا کہ آپ کھیتی باڑی کریں اور غلہ اگائیں یا درخت لگائیں اور باغات تیار کریں، بلکہ وہاں اللہ تعالیٰ نے دوسرا نظام رکھا ہے جو آسمانی نظام ہے، اس دنیا کی طرح مادی اور مٹی والا نظام نہیں ہے۔

دنیوی زندگی میں ہماری ساری ضروریات مٹی سے پوری ہوتی ہیں، مٹی ہی سے غلہ پیدا ہوتا ہے، درخت پیدا ہوتے ہیں، لوہا نکلتا ہے، تانبا اور دوسری دھاتیں نکلتی ہیں، مٹی ہی سے پٹرول اور تیل نکلتا ہے، مٹی ہی سے پانی نکلتا ہے، غرض کہ ہماری ضرورت کی تمام چیزیں اس حقیر مٹی ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

آسمانی نظام مٹی والے نظام سے مختلف ہے، وہ روحانی اور معنوی نظام ہے، وہاں آدمی کے عمل کی بنیاد پر چیزیں حاصل ہوں گی، خواہ ہم جو بھی عمل کرتے ہوں، صحیح راستہ پر چلنے کا عمل، معقول طریقہ اختیار کرنے کا عمل، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعہ سے لوگوں کو بتایا ہے اور بالخصوص امت محمدیہ کو آخری پیغمبر محمد ﷺ کے ذریعہ قرآن مجید کی شکل میں زندگی گذارنے کا پورا لائحہ عمل عطا کیا ہے۔

کعبۃ اللہ کا مقام

کعبۃ اللہ کا تعلق شعائر اللہ سے ہے کہ وہ زمین پر اللہ کا گھر ہے اور اس کا طواف وہاں کا سب سے مبارک عمل ہے اور اسی سے صفا و مروہ کی سعی بھی جڑی ہوئی ہے اور اس کو بھی قرآن مجید میں ''شعائر اللہ'' کہا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ: ۱۵۸)

(یقیناً صفا و مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں)

کعبہ مشرفہ جو بیت اللہ شریف کی اصل عمارت ہے، چار رکنی ہے، یہ مکہ معظّمہ کے پہاڑی پتھروں سے تعمیر کردہ ہے اور مرمت کی ضرورت پر کئی بار بنائی گئی ہے، لیکن اول بنیاد ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی اور ان کے بعد امام المتقین حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام نے اس کو بلند کیا اور بڑھایا:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (البقرۃ: ۱۲۷)

(اور جب ابراہیم و اسماعیل گھر (کعبہ) کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے (تو یہ دعا کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے رب! ہم سے (یہ عمل) قبول فرمالے، بے شک تو بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے)

کعبہ کی دیواروں کا رخ جنوب مشرق، شمال مشرق اور جنوب مشرقی رخ پر ہے،

اس کا دروازہ جنوب مشرقی دیوار کے جنوبی کونے کے قریب ہے اور وہ حصہ ''ملتزم'' کہلاتا ہے، دروازہ (باب کعبہ) اور ملتزم (حجر اسود اور باب کعبہ کا درمیانی حصہ) پر چمٹ کر دعا کی جاتی ہے اور قبولیت رکھتی ہے جس کا برابر تجربہ ہوتا رہا ہے، اس سے متصل کونہ میں حجر اسود کے ٹکڑے پیوستہ ہیں جس کا بوسہ دیا جاتا ہے یا اس پر قادر نہ ہونے کی صورت اور دشواری کی وجہ سے ''استلام'' یعنی ہاتھ کے اشارے سے یہ عمل کیا جاتا ہے، جو اس کا قائم مقام عمل ہوتا ہے، یہاں اور اس موقع پر دعا کی قبولیت کی بڑی امید کی جاتی ہے، یوں تو کعبہ مشرفہ کے ہر حصہ اور طواف وسعی کی جگہوں اور صفا و مروہ پر بھی دعا کی جاتی ہے اور یہ سب قبولیت دعا کے مقامات ہیں۔

کعبہ مشرفہ کے ارد گرد وسیع فرش ہے، جہاں نماز، تلاوت، ذکر و تسبیح و مناجات اور دعا کا عمل اور طواف ہوتا ہے، جو کعبہ کی اس چوکور عمارت کا کیا جاتا ہے، جو حج و عمرہ کا ایک حصہ اور مکہ مکرمہ حاضری کا تقاضا ہے اور اللہ کے نزدیک بہت محبوب عمل ہے۔

عمارت کے اندر کی سطح باہر کی سطح سے قد آدم سے بھی کچھ بلند ہے، کعبہ کے ارد گرد صحن اور عمارت کے باہر بڑی آبادی ہے، جو اب عمرہ اور حج کے لیے آنے والے حضرات کی عارضی قیام گاہوں کی نئی تعمیرات کی وجہ سے دور چلی گئی ہے، وہ سب علاقہ اور وہ علاقہ جو حدود حرم میں آتا ہے، حرم ہی کہا جاتا ہے اور متبرک حیثیت رکھتا ہے۔

منی، مزدلفہ اور عرفات

مکہ شہر سے مشرقی جانب تین کلو میٹر پر منی کا متبرک علاقہ ہے، اس سے پہلے عزیزیہ کے علاقہ تک اچھی آبادی قائم ہوگئی ہے اور عزیزیہ کا علاقہ حدود حرم میں ہی آتا ہے، اس کے علاوہ چاروں سمت پر آبادی پھیلا دی گئی ہے، جس سے حاجیوں کو بڑی سہولت حاصل ہو رہی ہے۔

منی کا علاقہ حج کے ایام میں حاجیوں کے پانچ دن کے قیام کی وجہ سے اہم

متبرک علاقہ ہے، اسی سے متصل مزدلفہ اور پھر عرفات کا علاقہ ہے، حج کے ختم ہونے کے لیے عرفات کا وقوف ضروری ہے، جو اس کے متعینہ وقت میں ضروری ہے، چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہو۔

منی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد پر قربانی کی جاتی ہے اور شیطان کو کنکری ماری جاتی ہے اور صفا و مروہ کی سعی حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی یادگار ہے جو اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیاس بجھانے کی خاطر ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑ لگا رہی تھیں اور زمزم کا پانی اسی کی برکت سے نکلا تھا، جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام پیر مار رہے تھے، اس میں اللہ نے شفا بھی رکھی ہے، پیاس بجھانے کا سامان بھی اور غذا کی طاقت بھی اور وہ چشمہ ایسا جاری فرمایا کہ اس کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا اور اس کی جو برکات ہیں وہ برابر حاصل ہوتی رہی ہیں اور سبھی لوگ اس سے سیراب ہوتے ہیں۔

خاندان ابراہیم کی مکہ آمد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد سے قبل مکہ کی آبادی ایک چٹیل میدان تھی، جہاں نہ کوئی انسان رہتا تھا، نہ کھانے کا انتظام تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی کنواں، لیکن عظیم مقاصد کے پیش نظر رب العالمین کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ اپنے اہل وعیال کو ایسی بے آب و گیاہ وادی میں تنہا چھوڑ جائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بسر وچشم یہ فیصلہ قبول کیا، تاہم جب اپنے اہل خانہ کو چھوڑ کر واپس جانے لگے تو بے ساختہ زبان سے یہ دعا جاری ہوگئی:

﴿رَبَّنَا إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ الصَّلَاةَ فَاجۡعَلۡ أَفۡئِدَةٗ مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ﴾ (ابراهيم: ۳۷)

(اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس ایسی وادی میں بسایا ہے جو بالکل بے آب و گیاہ ہے، اے ہمارے رب! صرف اس لیے کہ وہ نماز قائم رکھیں بس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ وہ ان کے مشتاق رہیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا تا کہ وہ شکرگزار رہیں)

جس بے آب و گیاہ وادی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل خانہ کو چھوڑا تھا، دراصل یہ وہی تاریخی جگہ تھی جہاں اللہ تعالیٰ کا روئے زمین پر وہ پہلا گھر ہے جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی اور جس کے متعلق خود قرآن میں ہے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ﴾ (آل عمران: ۹۶)

(سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے مبارک ہے اور تمام جہانوں کے لیے راہ نما ہے)

یہ مبارک جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قیام کے بعد توحید اور امن وسلامتی کا مرکز بن گئی، جب کہ اس سے قبل یہاں امن وامان مفقود تھا، اسی لیے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ اپنے اہل خانہ کو چھوڑا تو انہیں خدشہ ہوا کہ کوئی اس راستہ سے گذرنے والا ظالم قبیلہ انہیں اپنا یرغمال نہ بنالے نیز آپ کو یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کس طرح ہوگا، کیونکہ وہاں کی زمین ایسی نہ تھی جو سبزہ اگانے کے لائق ہو، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ﴾ (البقرة: ۱۲۶)

(اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے میرے رب! اس شہر کو امن کا گہوارہ بنادے اور یہاں والوں کو پھلوں کا رزق دے جو ان میں اللہ کو اور آخرت

کے دن کو مانیں)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک وہ جگہ لوٹ مار سے محفوظ ہے اور وہاں تمام انواع واقسام کے کھانے موجود ہیں، ہر طرح کا سامان اور ہر طرح کی ضروریات زندگی بھی میسر ہیں اور وہاں کے بازار عمدہ عمدہ مالوں سے پٹے پڑے ہیں۔

مکہ کی آبادی کی بنیاد

قرآن مجید میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہیں مکہ مکرمہ کی آبادی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ جگہ (مکہ مکرمہ) جس میں آج قریش آباد ہیں، یہاں آبادی کی بنیاد توحید پر رکھی گئی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ (البقرۃ: ۱۲۵)

(اور ہم نے (ابراہیم واسماعیل) سے عہد لیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے پاک کردو)

مذکورہ آیت میں پاکی کے حکم سے مراد ظاہری صفائی ستھرائی کے علاوہ مظاہر شرک سے تطہیر بھی ہے۔ اسی لیے متعدد مقامات پر قرآن مجید میں قریش کو مخاطب بنا کر کہا گیا ہے کہ جس جگہ کی بنیاد توحید پر رکھی گئی، اسی جگہ سے آخری نبی کی بعثت کے بعد توحید کی دعوت اٹھنی چاہیے۔

اعزاز براہیمی

کعبۃ اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خاص نسبت حاصل ہے، انہوں نے اولاً اس گھر کو از سر نو تعمیر کیا، اس کو آباد کیا اور اس کے بعد بحکم الٰہی لوگوں میں حج کرنے

کی منادی بھی کی، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ (الحج: ۲۷)

(اور لوگوں میں حج کی منادی کردو، وہ پیدل بھی آئیں گے اور ایسی دبلی پتلی اونٹنیوں پر بھی آئیں گے جو ہر دور دراز راستوں سے چلی آتی ہوں گی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیت اللہ سے اس غیر معمولی تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا مقام عطا فرمایا اور تمام لوگوں کے لیے پیشوا بنایا، ارشاد ہے:

﴿وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً﴾ (البقرة: ۱۲٤)

(اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو انہوں نے ان سب کو پورا کر دکھایا، ارشاد ہوا کہ ضرور میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں)

بیت اللہ کی فضیلت

اللہ کی ذات اور وہ عالم جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے قریب رکھا ہے یعنی آسمانی عالم، اس کو اللہ تعالیٰ نے زمینی عالم سے بہت اونچا مقام دیا ہے، ساری کائنات اللہ نے پیدا کی، یہ زمین اور آسمان سب اللہ تعالیٰ نے بنائے، لیکن ان میں سے کسی چیز کی نسبت اپنی طرف خاص کر کے اس کی اہمیت کو دوسری چیزوں کے مقابلہ میں بڑھا دیا ہے، انہیں چیزوں میں سے ایک کعبہ بھی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا گھر قرار دیا ہے، یوں تو ہر مسجد کو بیت اللہ (اللہ کا گھر) کہا جاسکتا ہے، لیکن کعبہ کو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ ''البیت'' کہا ہے، جس سے اس جگہ کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِّلنَّاسِ﴾ (المائدة: ۹۷)

(اللہ نے کعبہ کو جو بڑی حرمت والا گھر ہے انسانوں کی بقاء کا مدار بنایا ہے)

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ (البقرة: ۱۲۵)

(اور جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ مقرر کیا اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ)

اسی سورت کی ایک دوسری آیت میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ﴾

(البقرة: ۱۲۷)

(اور جب ابراہیم واسماعیل گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے)

اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو اپنا گھر کہا اور اپنے محبوب بندے اور نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف اس گھر کے تعمیر کی نسبت فرمائی اور اس کے لیے بھی ''قواعد'' کا لفظ لایا گیا جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان حضرات نے خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اوپر اٹھایا تھا، جب کہ اس کی اصل بنیاد انسانوں کے مورث وجد امجد حضرت آدم علیہ السلام کی رکھی ہوئی تھی، اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کے اس خاص حصہ سے اپنا خاص تعلق ظاہر کیا اور یہ بات ہے بھی کہ آسمانوں کا جو مقام ہے، وہ زمین کے مقام سے بہت بلند ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کے اس خاص حصہ (کعبہ مشرفہ) کو اپنی خاص نسبت کی وجہ سے ایسا کر دیا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی زمینوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ کی حیثیت کی ہوگئی ہے، ایک حدیث میں ہے:

"صلاة فی المسجد الحرام مائة ألف صلاة."(۱)

(مسجد حرام میں نماز (کا ثواب) ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔)

آسمانی نسبت کا فرق

کعبہ مشرفہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہونے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آسمان کے کسی بھی حصہ کو زمین کے کسی بھی حصہ کے مقابلہ میں سامنے لایا جائے تو اس کی نسبت ایک لاکھ گنا ثابت ہوگی، کیونکہ فی نفسہٖ زمین اور زمین والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت نیچا درجہ دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾ (التين: ٥)

(پھر ہم نے اس کو نیچوں سے نیچا گرادیا)

لیکن اپنی قدرت سے اس نے انسان کو بنایا اور اس میں کچھ صلاحیتیں ایسی رکھ دیں جو آسمانی ہیں، اسی لیے اس کا رتبہ کم ہونے کے باوجود بھی بہت بلند ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التين: ٤)

(ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں (ڈھال کر) پیدا کیا ہے)

نعمت غیر مترقبہ

کعبہ کی نسبت براہ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں جو برکات اور جو اجر وثواب پیدا ہوگیا ہے، اس کو کم از کم تعداد کے اجر کے فرق سے سمجھا جاسکتا ہے، ظاہری طور پر ہر چیز دیکھی نہیں جاسکتی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی حقیقت کو بتادیا جائے تو اس سے کون مانع بن سکتا ہے، وہاں حاضر ہونا، اس کے سامنے ادب سے بیٹھنا اور اپنے پروردگار سے اسی نسبت سے مانگنا، یہ بلاشبہ بہت خیر کا ذریعہ ہے۔

(۱) شعب الإيمان للبيهقي، فضل الحج والعمرة: ٤١٤٤

www.abulhasanalinadwi.org

ظاہری طور پر دیکھنے میں بیت اللہ ایک چوکور عمارت ہے، لیکن اگر کوئی شخص دل کے جذبات واحساسات سے اس کا مشاہدہ کرے تو وہ خود اس میں بہت تاثیر محسوس کرے گا، واقعہ یہ ہے کہ وہاں جانا گویا زمینی انسان کا آسمانی علاقہ میں پہنچ جانا ہے اور اگر غور کیا جائے تو انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے اس زمین پر رہتے ہوئے آدمی کو آسمانی درجہ کا فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرمایا، اب آدمی کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے اور اپنے نامہ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ جمع کرے۔

کعبہ کو دیکھنے اور وہاں نماز ادا کرنے کی جو فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، ان کے ضمن میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں جائے اور اس کی ناقدری کرے یا وہاں بھی اس کے ذہن میں غلط خیالات کا ہجوم رہے تو اس کے متعلق قرآن مجید میں سخت وعید آئی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (الحج: ۲۵)

(اور جو اس میں شرارت سے کجی کا ارادہ بھی کرے گا تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے)

کعبہ دنیا کا مرکزی نقطہ

بیت اللہ کی ایک خصوصیت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ دنیا کے علاقوں کو سامنے رکھ کر اس کو دیکھا جائے تو وہ مرکزی نقطہ پر ہے، گویا بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے مرکز بنایا اور دنیا کو اس کے اردگرد آباد کیا ہے۔

بیت اللہ اس عمارت کو سمجھا جاسکتا ہے جو کعبہ کی ہے، لیکن اس کے علاقہ کو صرف اسی تک محدود نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ پورا حرم مکی جس کے حدود بتائے گئے ہیں، اسی میں شامل کیے گئے ہیں۔

عظیم ترین مقام

کیا عظیم ترین مقام ہے! گویا آسمان کا ایک ٹکڑا یہاں زمینی حیثیت کو ہٹا کر اس کی جگہ رکھ دیا گیا ہے کہ حق پرست انسان کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور الحمد للہ اس جگہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں محبت الٰہی سے سرشار لوگ وہاں ہر سال پہنچتے ہیں اور اپنے دل کی دینی پیاس بجھاتے ہیں اور خاص سرور اور قلبی راحت حاصل کرتے ہیں۔

عجیب مقام ہے! جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے مہیا کر دیا ہے، جو اللہ کی رحمتوں کا مرکز ہے اور اللہ والوں کی اجتماعیت کا عظیم نشان ہے، تمام اہل ایمان اپنے رنگ و کیفیت کے فرق کے باوجود وہاں ایک جیسے مؤمن کی حیثیت سے اکٹھا ہوتے ہیں اور ایمان کی اجتماعیت کا مظاہرہ پیش کرتے ہیں اور ایمانی برکات کی سوغات اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اپنے وطن کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا شمار شعائر اللہ میں ہوتا ہے، آپ کی ہستی پوری دنیائے انسانیت کے لیے خیر اور رحمت کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ساری انسانیت کو بتادیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے خاص طور پر سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء: ۱۰۷)

(اور ہم نے آپ کو سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

واقعہ یہ ہے کہ آج روئے زمین پر آپ کی وجہ سے ساری انسانیت کو فائدہ پہنچ رہا ہے، جو مسلمان ہوگئے ہیں ان کو اس طرح کہ وہ اللہ والے ہوگئے اور جو نہیں ہوئے ان کو بھی اس طرح پہنچ رہا ہے کہ زندگی گذارنے کا قرینہ ان کو حاصل ہوگیا ہے، اس لیے کہ یہ دین جامع ہے اور پوری انسانی زندگی پر محیط ہے، اس میں زندگی کے سارے شعبے اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے، ورنہ اور ادیان میں عبادت تک بات ختم ہوجاتی ہے، ان میں عبادت کے بعد جو چاہو کرو، زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے سلسلہ میں ان کے یہاں کوئی رہنمائی نہیں ہے، انسان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ تم اپنی عقل سے مسئلہ حل کرلو، لیکن ہدایات نہیں ہیں، اگر کسی کو ان ہدایات سے مستفید ہونا ہے تو وہ صرف مذہب اسلام میں ہیں، اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ہدایات ہیں اور صرف

ہدایات ہی نہیں ہیں، بلکہ ان ہدایات پر عمل بھی ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں معاشرہ ترقی کرتا ہے اور اگر اس میں کوئی سستی ہوتی ہے تو اللہ کا نظام یہ ہے کہ اس امت میں ہر دور میں اتنے افراد اور اتنے صلحاء گذرتے رہے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ اسی لیے ہوا ہے تاکہ انسانی حالات اچھے رہیں اور معاشرہ ترقی کی اعلیٰ مثال بن سکے۔

دین اسلام کی طبعی تاثیر

دین اسلام ایک ایسا فطری نظام ہے جس کو دیکھ کر غیروں کو غیر معمولی فائدہ پہنچا ہے، گویا اگر اس زمین پر مسلمان نہ ہوتے تو غیر مسلموں کی حالت اور زیادہ بدتر ہوتی، یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ ان میں بہت سی اچھائیاں مسلمانوں کی صحبت ہی سے آگئی ہیں، وہ اسلام تو نہ لائے لیکن اسلامی تعلیمات سے متاثر ضرور ہوئے۔

اسلام آنے سے قبل خود ہمارے ملک کا حال یہ تھا کہ یہاں کے لوگ ننگے رہتے تھے، وہ ایک چادر اور کپڑا لپیٹ لیتے اور تقشّف ورہبانیت میں لگے رہتے تھے، اپنی زندگی جانوروں کی طرح گذارتے تھے، ان کے یہاں کھانے کا بھی کوئی سلیقہ نہ تھا، اسی لیے جب اسلامی تہذیب کو انہوں نے دیکھا تو انہوں نے بہت سی باتیں مسلمانوں سے سیکھیں، جس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی بے تحاشہ فائدہ پہنچایا ہے۔

یورپ کی حالت پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ جب اسلام آیا اس وقت اس کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، وہاں علم کو جرم سمجھا جاتا تھا، کوئی تعلیم حاصل نہیں کرسکتا تھا، حصول علم پر باقاعدہ سزا ہوتی تھی، اس لیے کہ ان کے جو پادری ہوتے تھے ان کا تسلط تھا، بادشاہ بھی ان کی بات ماننے پر مجبور تھا، اگر کوئی علم کی بات کرتا تو اس کی سزا ہوتی تھی، کئی لوگوں کو اسی بات پر پھانسی دی گئی، اسی طرح ان کے یہاں علاج کا بھی کوئی نظم نہ تھا، جادوٹونے اور عملیات ہی سے وہ علاج کرتے تھے، دواؤں کا ان کے یہاں کوئی

تصور نہ تھا، بالکل جانوروں والی زندگی تھی، لیکن مسلمانوں نے ان میں علم کا شعور پیدا کیا اور وہ تہذیب وتمدن سے آشنا ہوئے جس کو متفقہ طور پر سب ہی مانتے ہیں۔

غرض کہ اسلام کے آنے سے اور حضور ﷺ کے امتیوں سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچا، اس وقت ہم اور آپ دنیا میں جو خیر دیکھ رہے ہیں، یہ مسلمانوں اور اسلام ہی کی برکت ہے، اگر چہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ یورپ کی دین ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے خود سب کچھ مسلمانوں ہی سے سیکھا۔ صحبت سے غیر معمولی اثر پڑتا ہے، اگر آپ نیک آدمی کی صحبت میں رہیں گے تو آپ اس کی نیکیاں سیکھ لیں گے اور برے آدمی کی صحبت میں رہیں گے تو برائیاں سیکھ لیں گے، تو مسلمانوں کی صحبت اور ان کے اثر سے جو غیر مسلموں کو فائدہ پہنچا، اس کی وجہ سے ان میں تہذیب آ گئی، اس سے پہلے وہ شائستہ نہ تھے، وہ جانوروں والی زندگی گذارتے تھے، علم کو برا سمجھتے تھے، لیکن اسلام کے بعد ان کے تمام نظریے بدل گئے۔

رحمۃ للعالمین ﷺ

حضور ﷺ کی آمد ساری کائنات اور سارے عالموں کے لیے رحمت کا ذریعہ بنی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایک مرتبہ اسی موضوع کو اپنی سیرت کی ایک تقریر میں بیان کر رہے تھے، انہوں نے اپنی تقریر میں ایک پر لطف کیفیت کے ساتھ بڑے جوش میں فرمایا کہ حضور ﷺ کی رحمت کا نتیجہ ہے کہ آج یہ لاؤڈ اسپیکر ہمارے سامنے ہے جس سے ہم آواز کو تیز کر سکتے ہیں، اگر حضور ﷺ کی تعلیمات نہ آئی ہوتیں اور مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی شائستگی اور دین داری لوگوں کے سامنے نہ آتی تو دنیا ترقی کی ان منازل سے کبھی بھی ہم کنار نہ ہوتی۔

مسلمانوں کا جو علم سے تعلق رہا ہے وہ غیر معمولی ہے، موجودہ دور میں جو غیروں کے یہاں علم کی رمق نظر آتی ہے، یہ سب غیروں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے خواہ

وہ نہ مانیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے پاس کچھ نہ تھا، جب علم ہی نہیں تھا تو کیا تھا، اب جو ساری ایجادات آرہی ہیں، گرچہ کہنے کو ان کی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو شعور کہاں سے پیدا ہوا؟ لامحالہ اس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ شعور مسلمانوں ہی سے ان میں آیا، علم کی طرف توجہ کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ یہ سب انہوں نے مسلمانوں ہی سے سیکھا اور اس میں ترقی کرتے چلے گئے اور مسلمان اس میں غفلت کرنے لگے تو پیچھے چلے گئے، لیکن سیکھا انہوں نے مسلمانوں سے ہی ہے۔

اس وقت جو کچھ بھی ہم اور آپ اس دنیا میں اچھی بات یا اچھا نظام دیکھ رہے ہیں، یہ اکثر وہ ہے جو حضور ﷺ کی بعثت کا نتیجہ ہے، قرآن مجید میں انہیں تمام حقائق کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یہ کوئی معمولی جملہ نہیں ہے، اس کو یوں سمجھیں کہ آپ ﷺ کی بعثت سے پوری دنیا سنبھل گئی، اس میں معقولیت آگئی، دنیا کے لوگ جانور بنے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے ان کو انسان بنادیا، بس یہ ایک کسر رہ گئی کہ وہ مسلمان بھی ہوجاتے اور شریعت پر پوری طرح عمل کرنے لگتے، لیکن ایسا انہوں نے اپنی ضد میں نہیں کیا، البتہ شائستگی اور معقولیت اور خیر کی تمام چیزوں کو مسلمانوں ہی سے حاصل کیا۔

قدردانی کا مطالبہ

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حضور ﷺ کے متعلق یہ توجہ دلائی کہ لوگوں کو نبی رحمت ﷺ کی قدر کرنا چاہیے کہ اللہ نے ان میں ایک ایسا رسول بھیجا جو ان سے محبت کرتا ہے، ان کی فکر میں گھلا جاتا ہے اور اس کو ہمہ وقت لوگوں کو اچھا بنانے کی فکر رہتی ہے، ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبة: ۱۲۸)

(یقیناً تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آ چکے، تمہاری تکلیف جن کو بہت شاق گذرتی ہے تمہاری (بھلائی) کے بہت خواہش مند ہیں ایمان والوں کے لیے تو بڑے شفیق بہت مہربان ہیں)

اس کیفیت کا اظہار ایک موقع پر خود آپ ﷺ نے بھی مثال دے کر فرمایا:

"مثلی ومثلکم کمثل رجل أوقد نارا فجعل الجنادب والفراش یقعن فیها وهو یذبهن عنها وأنا آخذ بحجزکم عن النار وأنتم تفلتون من یدی."(۱)

(میری اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی اور پتنگے اور پروانے اس میں گرنے لگے اور یہ شخص انہیں اس سے ہٹا رہا ہے، (اسی طرح) میں تمہیں پکڑ پکڑ کر (جہنم کی) آگ میں گرنے سے بچا رہا ہوں، لیکن تم میرے ہاتھوں سے نکلے جاتے ہو۔)

نبی اکرم ﷺ کی اسی غیر معمولی کڑھن کی خاطر قرآن مجید میں تسلی دی گئی ہے کہ آپ کسی کی ہدایت کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کریں، اس لیے کہ ہدایت دینا یا نہ دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے، آپ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (الشعراء: ۳)

(شاید آپ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیں گے کہ وہ ایمان نہیں لاتے)

محبت رسول ﷺ

آپ ﷺ کا احترام کرنا، آپ کی باتوں پر عمل کرنا، آپ کے حکموں کی تعمیل کرنا، آپ سے محبت کرنا تمام اہل ایمان پر لازمی ہے، قرآن مجید میں حب نبوی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب شفقته علی أمته: ٦٠٩٨

(ﷺ) کو دین کی بنیاد اور ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

(التوبة: ٢٤)

(آپ کہہ دیجیے کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کما رکھا ہو اور وہ کاروبار جس کے ٹھپ ہو جانے کا تمہیں ڈر ہو اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہوں اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا)

حدیث شریف میں نبی ﷺ سے محبت کے متعلق آتا ہے کہ آدمی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ ایک صاحب ایمان کو رسول اللہ ﷺ سے محبت اپنی اولاد اور اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ نہ ہو جائے، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من ولده ووالده والناس أجمعين."(١)

(تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، اس کے باپ اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب اور عزیز نہ ہو جاؤں۔)

(١) صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب وجوب محبة رسول الله...: ١٧٨

www.abulhasanalinadwi.org

صحابہ کرام کا عشق رسول

محبت کے اس اعلیٰ معیار پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں سو فیصد پوری اترتی ہیں، ان کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں حضور ﷺ سے اپنی جان سے بڑھ کر محبت تھی، انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کی جگہ حضور ﷺ کو ادنی درجہ بھی تکلیف پہنچے، حضرت خبیب بن عدیؓ کے متعلق آتا ہے کہ جب انہیں تختہ دار پر لے جایا جانے لگا تو کسی نے سوال کیا:

"أتحب أن محمدا مكانك؟"

(کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد (ﷺ) تمہاری جگہ ہوں؟)

اس نازیبا سوال پر حضرت خبیبؓ نے انتہائی محبت وفدائیت بھرا جواب دیا:

"لا والله العظيم! ما أحب أن يفديني بشوكة يشاكها في قدمها."(۱)

(قسم بخدا! نہیں، میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ میرے بدلہ آپ ﷺ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھے۔)

غزوۂ احد کے موقع پر دشمنوں کی طرف سے تیروں کی بارش ہورہی تھی، ایسے سنگین موقع پر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ آپ کے لیے ڈھال بن گئے اور اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر حضور ﷺ سے درخواست کی:

"بأبي أنت وأمي! لا تشرف يصيبك سهم من سهام القوم، نحري دون نحرك."(۲)

(میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نظر نہ اٹھائیں، کہیں دشمنوں کا

---

(۱) السيرة النبوية لإبن كثير: ۱۳۱/۳

(۲) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب...: ٤٠٦٤

www.abulhasanalinadwi.org

کوئی تیر آپ کو نہ آ لگے، میرا سینہ آپ کے مبارک سینہ کے لیے سپر ہے۔)

واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کو آپ ﷺ سے غیر معمولی محبت تھی اور اسی محبت کا مطالبہ سارے امتیوں سے ہے کہ آپ سے ایسی محبت ہو جو سوائے اللہ کے کسی سے نہ ہو، نہ ماں باپ سے، نہ اولاد سے، نہ مال ومتاع سے، کسی بھی چیز سے اتنا لگاؤ اور محبت نہ ہو جتنی اللہ کے رسول سے ہو، کیونکہ جب محبت ہوگی تو انسان آپ کے نمونہ پر عمل بھی کرے گا، آپ کی سنت کی پیروی بھی کرے گا اور آپ کی ہر چیز کو اچھا بھی سمجھے گا۔

ایمان کامل کا تقاضا

ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کہ اس کو اللہ کے رسول ﷺ سے کتنی محبت ہے اور اس محبت کا اندازہ صرف کہنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب اس محبت کے مقابلہ میں کوئی چیز آجائے، عموماً آدمی کو دنیا کے منافع، مال ومتاع اور اولاد سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اس سے دین کے معاملہ میں خلل پڑنے لگتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا اور یہ فرمادیا کہ تمہاری اولاد، تمہارا مال و دولت تمہارے لیے فتنہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

(الأنفال: ۲۸)

(اور جانے رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے اور بڑا اجر تو اللہ ہی کے پاس ہے)

عربی زبان میں ''فتنہ'' کے معنی لبھا کر آدمی کو اصل راستہ سے ہٹانے کے ہیں، یعنی آدمی شوق میں غلط کام کرنے لگے، کسی چیز کو اتنا پسند کرے اور اس سے اتنا لگاؤ ہو کہ اس کی وجہ سے وہ غلط کام کردے۔

اللہ کے رسول ﷺ سے آدمی کو اگر صحیح محبت ہو، جیسی محبت کا مطالبہ ہے کہ اس

کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوگا تو پھر وہ شخص ہزار چیزوں اور تقاضوں کے باوجود بھی اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہیں کرسکتا، کیونکہ انسان کو جس سے محبت وعقیدت ہوگی وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، لہٰذا ایمان کے مکمل ہونے اور شریعت پر صحیح عمل کے لیے اولین ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے حقیقی محبت ہو۔

آداب نبوی ﷺ

قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ سے محبت کے ساتھ، ان آداب کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، جن کے نہ سمجھنے سے بسا اوقات انسان غیر شعوری طور پر ایمان کے دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے، سورۂ حجرات میں اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اپنے نبی کا مقام سمجھو، ان کی نگرانی اور سرپرستی اللہ کی طرف سے خصوصی طور پر ہورہی ہے، لہٰذا ان سے کوئی ایسی بات سرزد ہی نہیں ہوسکتی جو اللہ تعالیٰ کی پسند کے خلاف ہو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ایک نمونہ ہیں، اس لیے ان کے ساتھ تمہارا برتاؤ اور معاملہ اس طرح ہونا چاہیے کہ ان کی ہر بات کو اللہ کا حکم اور مشیت سمجھا جائے اور اس پر عمل اس لیے لازماً کرنا ضروری سمجھا جائے کہ یہ خدا کی طرف سے حکم ہے، لہٰذا ہم اس سے روگردانی نہیں کرسکتے۔

سورۂ حجرات میں آداب نبوی ﷺ کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (الحجرات: ۱)

(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے)

بے تکلف زندگی میں بسا اوقات ادب واحترام کا وہ معیار ملحوظ نہیں رہ پاتا جس کا مطالبہ ہوتا ہے، مثلاً؛ عام طور پر گھر میں بیٹا باپ کا اس طرح احترام نہیں کرپاتا جیسا

کرنا چاہیے، اس لیے کہ ہر وقت کا ملنا جلنا رہتا ہے اور ہر وقت ملنے جلنے میں بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح صحابہ کرام کو ہر وقت حضور ﷺ سے جو واسطہ پڑتا تھا تو اس کا امکان ہو گیا تھا کہ وہ اتنا احترام اور اتنا خیال نہ کر سکیں جتنا کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں بعض مرتبہ کچھ لوگوں سے غلطی بھی ہوئی، اسی لیے قرآن مجید میں اللہ کا صاف صاف حکم آ گیا کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے، یعنی نبی ﷺ کے سامنے اپنے کو نہ بڑھاؤ، اپنے کو چھوٹا رکھو، ان سے معاملہ کرنے اور بات کرنے میں یہ نہ ہو کہ تم ان سے بات کرنے میں اپنی آواز بلند کرنے لگو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ کہیں مسلمانوں کی یہ حرکت اللہ کی ناراضی کا سبب نہ بن جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے رسول جس کو اس نے اپنا لیا ہے اور مخصوص کر لیا ہے، اس کے سامنے تم برابری کا معاملہ کرو اور ان سے بحث کرو یا ان کی بات میں دخل دو۔

اخلاق نبوی ﷺ

حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ آپ ﷺ کی شفقت، آپ کا کرم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی شخص آپ کی توہین کر دے تو آپ اس کا بدلہ نہیں لیتے تھے، کوئی سختی سے پیش آ جاتا تو بھی آپ کچھ نہ کہتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"ما انتقم رسول الله صلى الله عليه وسلم لنفسه إلا أن تنتهك حرمة الله تعالى فينتقم لله بها."(۱)

(رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کا انتقام نہیں لیا، ہاں اگر اللہ کی حدود پامال کی جائیں تو آپ ان کا انتقام لیتے تھے۔)

(۱) صحيح مسلم، كتاب الأدب، باب في التجاوز في الأمر: ٤٧٨٧

www.abulhasanalinadwi.org

آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی انتہا تو یہ تھی کہ اگر کبھی آپ نے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا اور لوگ پہلے سے آکر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے یا کھانے کے بعد باتوں میں مشغول ہو گئے، جس سے آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو دشواری ہوتی تو اس پر بھی آپ ﷺ کچھ نہیں فرماتے تھے، بلکہ آپ برداشت کرتے تھے، اسی لیے قرآن مجید میں اس کے متعلق وضاحت سے کہا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِيْنَ إِنَاهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِيْ مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الأحزاب: ۵۳)

(اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل مت ہو جب تک تمہیں کھانے کے لیے اجازت نہ مل جائے، اس کے پکنے کی راہ دیکھتے نہ رہو، ہاں جب تمہیں بلایا جائے تو داخل ہو پھر جب کھا چکو تو اپنی اپنی راہ لو، باتوں میں جی لگاتے مت بیٹھو، یقیناً یہ چیز نبی کو تکلیف پہنچاتی ہے بس وہ تم سے شرم کرتے ہیں اور اللہ کو ٹھیک بات کہنے میں کوئی شرم نہیں)

حاصل بحث یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے احترام کی قرآن مجید میں جگہ جگہ تاکید فرمائی ہے، اس لیے کہ نبی عام انسان نہیں ہے، اللہ نے ان کو اپنا لیا ہے، اپنے سے قریب کر لیا ہے اور ان کو مخصوص کر لیا ہے، لہٰذا ان کو اللہ کی طرف سے ایک حصار حاصل ہو گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہو گئے ہیں، اب اگر ان کے ساتھ کوئی ناروا معاملہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو برا لگے گا، اس کی یہ حرکت اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئے گی کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا لیا ہے اور اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے، ان کو کوئی شخص، عام آدمی یا اپنا ساتھی یا عزیز سمجھے۔

بلند آواز سے ممانعت

سورۂ حجرات کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ (الحجرات: ۲)

(اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو، نبی کے سامنے اپنی آواز کو اونچا نہ کرو، ان کی آواز پر اپنی آواز کو نہ بڑھاؤ، جیسا کہ تم آپس میں بات کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ بے شعوری میں تمہارے اعمال ہی اکارت ہو جائیں)

اس آیت میں ایمان والوں کو خطاب کیا گیا ہے کہ وہ آداب نبوی کا لحاظ رکھیں، انہیں اس بات کا خیال رہے کہ وہ نبی کے سامنے اپنی آوازوں کو اونچا نہ کریں، یعنی نبی جس آواز سے بولتے ہیں، اہل ایمان اس سے پست آواز میں بولیں، تاکہ فرق معلوم ہو کہ تم نبی سے چھوٹے ہو، لہٰذا جس طرح تم اپنی بات ثابت کرنے کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے تیز لہجہ میں بات کرتے ہو، اس طرح نبی کے سامنے ہرگز بات نہ کرو، نبی کے سامنے بہت ادب اور تواضع کے ساتھ بات کرنی چاہیے، اس لیے کہ خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں، تمہاری نیکیاں ضائع ہو جائیں، تمہاری یہ برائی ان نیکیوں کو ختم کر دے، کیونکہ اگر اللہ کو برا لگ گیا کہ اللہ کے نبی کے ساتھ تم نے اس طرح گستاخانہ لہجہ میں بات کی ہے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اچھے اعمال کو بھی قبول نہیں فرمائے گا، بلکہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے اور تم کو اس کا احساس بھی نہ ہو سکے گا، تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ ہم نے بہت اچھے اچھے کام کیے ہیں، لیکن آخرت میں پتہ چلے گا کہ تمہاری فلاں غلطی سے تمہارے وہ سب نیک اعمال مٹ گئے تھے۔

احتیاط کی تعلیم

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾

(الحجرات: ۳)

(اللہ کے رسول کے سامنے جولوگ اپنی کوآواز کو پست کرتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کا امتحان لے لیا ہے اوران کے تقوی کوتسلیم کرلیا ہے، ان کو اللہ کی طرف سے بڑی مغفرت اوراجرعظیم حاصل ہوگا)

مذکورہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جوآپ ﷺ سے بات کرنے میں احتیاط کرتے ہیں، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سلسلہ میں بہت احتیاط کرتے تھے، بعض وقت صحابہ کرام آپ ﷺ سے اتنی آہستہ بات کرتے تھے کہ اس کو سننے میں دشواری ہونے لگتی تھی، آپ ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام کی طمانیت و وقار اور حاضر دماغی کے چرچے دور دور تک تھے، حضرت اسامہ بن شریک حضور ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ادب سے متعلق فرماتے ہیں:

"إذا تكلم أطرق جلساؤه كأنما على رؤوسهم الطير."(۱)

(جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو آپ کے ہم نشیں اپنے سروں کو اس طرح جھکا لیتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔)

دربار رسالت مآب علیہ السلام میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈرتے رہتے تھے، آپ ﷺ کی بات کو نہ کاٹتے تھے اور نہ ہی آپ سے زیادہ سوالات کرتے تھے، اس لیے کہ اس کا بھی حکم دیا گیا تھا کہ جب نبی کوئی بات کہے تو نہ زیادہ سوال کرو، نہ ہی

(۱) شعب الإيمان للبيهقي، باب في حب النبي ﷺ، فصل في خلق الرسول ﷺ وخلقه: ۱۴۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

زیادہ پوچھو، وہ جتنی بات بتادیں بس اسی پر اکتفا کرو، اسی سے پورا مطلب سمجھ لو اور اسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہ کرو، ایک جگہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (المائدۃ: ۱۰۱)

(اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ اگر وہ تمہارے لیے کھول دی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر تم اس وقت ان کے بارے میں پوچھو گے جس وقت قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تمہارے لیے کھول دی جائیں گی اللہ نے ان کو معاف کر رکھا ہے اور اللہ تو بڑی مغفرت فرمانے والا بڑا حلیم ہے)

نبی اکرم ﷺ نے بھی ایک موقع پر زیادہ سوالات کرنے سے منع فرمایا:

"نهى عن ثلاث؛ قيل وقال و كثرة السؤال وإضاعة المال."(۱)

(آپ ﷺ نے تین باتوں سے منع فرمایا؛ چہ می گوئی سے، زیادہ سوال کرنے اور مال ضائع کرنے سے۔)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے بطور نصیحت قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا قصہ بھی ذکر کیا، جس میں زیادہ سوال کرنے کے نقصان کو واضح کیا گیا ہے، بنی اسرائیل سے جب گائے کی قربانی کو کہا گیا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھنے لگے کہ گائے کیسی اور کس طرح کی ہو؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے زیادہ سوالات پر ایسی کڑی شرائط عائد کردیں جن کے نتیجہ میں انہیں ویسی گائے تلاش کرنے میں غیر معمولی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو زیادہ سوالات کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ اس سے

(۱) مسلم، كتاب الأقضية، باب النهي عن كثرة المسائل من غير حاجة: ٤٥٨٣

www.abulhasanalinadwi.org

تنگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، آپ ﷺ نے صحابہ کا یہ مزاج بنا دیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی سلسلہ میں ایک عام بات کا حکم دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور جس طرح سے جو ہوسکتا ہو وہ کرو، اس میں بے جا نکتے نہ نکالو، تاہم خود حضور ﷺ کے متعلق یہ ہے کہ آپ ﷺ جو فرمائیں اسے سن لو اور اس پر عمل کرو، اس کے متعلق زیادہ نہ پوچھو اور اسے حد سے زیادہ نہ کریدو، صاف صاف مختصر الفاظ میں کہہ دیا گیا:

﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: ۷)

(رسول تمہیں جو دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو)

صحابہ رضی اللہ عنہم کی احتیاط

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ جب ان کو حضور ﷺ سے کوئی چیز معلوم کرنی ہوتی تھی تو ہزار دفعہ سوچتے تھے کہ کس طرح پوچھیں، کہیں گستاخی یا بے ادبی نہ ہو جائے، حضرت براء بن عازبؓ اپنی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”إن كان ليأتى علي السنة أريد أن أسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الشئ فأتهيب.“(۱)

(بسا اوقات اس ارادہ میں میرا پورا سال گذر جاتا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ سے کسی چیز کے متعلق سوال کروں، مگر میں پھر بھی گھبرا جاتا تھا۔)

روایات میں ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی نہ کسی دیہاتی کی آمد کے منتظر رہتے تھے، تاکہ وہ آپ ﷺ سے سوال کرے تو انہیں بھی اس سے مستفید ہونے کا موقع نصیب ہو سکے؛

”كنا لنتمنى الأعراب –أى قدومهم– ليسألوا فيسمعوا.“(۲)

(ہم (صحابہ) بدوؤں کے آنے کی تمنا کرتے تھے، تاکہ وہ سوالات کریں

(۱) فتح الباری، کتاب الإعتصام بالکتاب والسنة، باب ما یکره من کثرة السؤال: ۲۰/ ۳٤۰

(۲) أیضاً

www.abulhasanalinadwi.org

تو ہم ان کے جوابات سن سکیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس غیر معمولی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ قرآن مجید نے بھی ان کے ادب کی شہادت دی ہے، سورۂ حجرات کی تیسری آیت میں - جو ابھی اوپر گذری - انہیں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی آواز کو اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے دبا لیتے ہیں، نیچی کر لیتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوی کے لیے جانچ لیا ہے، یعنی یہ لوگ عمل میں صحیح ثابت ہوئے ہیں اور رب العالمین کی جانچ میں پورے اترے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے رسول کے ساتھ نرم لہجہ اور آہستہ سے بات کی جائے، یہ لوگ اس کی مکمل احتیاط کرتے ہیں، اسی لیے فرمایا گیا کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

بلند آواز سے پکارنے کی ممانعت

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ☆وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (الحجرات: ٤-٥)

(جو لوگ آپ کو آپ کے گھروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بات کو سمجھتے نہیں، حالانکہ اگر وہ تھوڑا صبر کر لیں تو یہ بات ان لوگوں کے لیے بہتر ہوگی اور اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا ہے اور رحم کرنے والا ہے)

اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو صحابہ کے برعکس تھے، یعنی وہ دیہاتی لوگ جو گاؤں دیہات سے آتے تھے اور اکھڑ ہوتے تھے، جو تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں جانتے تھے، بڑے سے کس طرح بات کرنا چاہیے، برابر والے اور چھوٹے سے بات کرنے کا کیا طرز ہونا چاہیے، انہیں ان آداب کا کچھ بھی علم نہ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دیہات کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے گھر کے باہر

سے محمد محمد پکارنا شروع کر دیا تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی بات سنا سکیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کا یہ آواز لگانا کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض ناواقفیت کی بنیاد پر تھا، لیکن بے ادبی بے ادبی ہی ہوتی ہے خواہ بری نیت سے نہ ہو، اسی لیے قرآن مجید میں فوراً تنبیہ کی گئی کہ جو لوگ آپ کو آپ کے گھروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بات کو سمجھتے نہیں، ان میں اتنی سمجھ نہیں کہ کس طرح حضور ﷺ کو بلانا چاہیے، کس طرح آپ سے درخواست کرنی چاہیے، حالانکہ اگر وہ تھوڑا صبر کر لیں اور انتظار کر لیں کہ جب آپ اپنے گھر سے نکلیں تب آپ سے بات کریں، آپ کو گھر کے اندر سے آواز دے کر نہ بلائیں، کیونکہ نہ جانے آپ کس حال میں ہوں، کس مشغولیت میں ہوں؟ تو یہ بات ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہوگی۔

ان لوگوں نے آپ ﷺ کو گھر کے باہر سے کسی بدنیتی کے ساتھ آواز نہیں دی تھی، اسی لیے تنبیہ کے معاً بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کی اس غلطی کو معاف کر رہا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا یہ کام غلط اور نقصان دہ ہے۔ البتہ وہ شہری لوگ جن کو یہ چیزیں معلوم ہیں اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ ان کو بھی تنبیہ کر دی کہ اس بات کا لحاظ رکھو، اللہ کے نبی کو تم معمولی چیز نہ سمجھو، ان کا اللہ سے خاص تعلق ہے اور اس تعلق کی وجہ سے ان کو تم پر ایسی برتری حاصل ہوگئی ہے کہ کسی اور کو وہ برتری حاصل نہیں ہے، گرچہ وہ انسان ہیں لیکن اللہ نے ان کو اپنا لیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی پوری سرپرستی فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایات دیتا ہے اور ان کی ہر بات اللہ کی جانب ہی سے ہوتی ہے، فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ☆ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾

(النجم: ٣-٤)

(آپ جو بات بھی کہتے ہیں اپنے دل سے نہیں کہتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے اشارہ اور رہنمائی کی بنیاد پر کہتے ہیں)

معلوم ہوا آپ کے کہنے کو آپ کا کہنا نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ درحقیقت وہ اللہ کا کہنا ہوتا ہے، البتہ آپ کے واسطہ سے تمام لوگوں تک پہنچتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست کسی کو مخاطب نہیں کرتا، اگر اللہ تعالیٰ کی بات براہ راست آئے تو اس کو انسان برداشت ہی نہیں کرسکتا۔

مندرجہ بالا آیات میں خاص طور پر عربوں کو ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ عربوں کا مزاج بہت بے تکلف تھا، وہ بادشاہ سے بھی خطاب لفظ ''تم'' سے کرتے تھے، عربوں کے یہاں یہ تہذیب عجم سے آئی، جو ایک اچھی تہذیب ہے کہ مختلف لوگوں کے درجات کے مطابق ان سے معاملہ کرنا چاہیے، عرب بادشاہ سے یوں مخاطب ہوتے تھے جیسے کسی عام انسان سے، مثلا: ''اے بادشاہ! تمہیں ایسا کرنا چاہیے''۔ چند سادہ لوح عربوں نے حضور ﷺ کے ساتھ بھی ایسا کر دکھایا، لیکن عموماً یہ حال نہیں تھا، بعض صحابہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہم نے غایت درجہ ادب اور رعب کی وجہ سے حضور ﷺ کو کبھی نگاہ بھر کر نہیں دیکھا، صحابی رسول حضرت عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں:

"ما كنت أطيق أن أملأ عيني منه إجلالا له."(۱)

(میری کبھی بھی ہمت نہ ہوئی کہ میں آنکھ بھر کر آپ ﷺ کو دیکھ لوں، آپ کی غایت درجہ تعظیم کی وجہ سے)

اس شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو عربوں کی قدیم عادت کے مطابق خطاب کرنے والے کچھ نئے لوگ تھے یا انہیں پرانے لوگوں میں ایسے تھے جو زور سے بات کرنے لگے، پکارنے لگے، اس لیے کہ کثرت کے ساتھ رہنے میں بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے، اسی لیے ہدایت دے دی گئی کہ نبی ﷺ سے اپنی آواز اونچی نہ کرو، بلکہ ان کی بات سنو، وہ تمہارے معلم ہیں، تمہارے ہادی ہیں، تمہیں ان سے لینا

(۱) الشفا للقاضي عياض، فصل في عادة الصحابة: ۳۸

www.abulhasanalinadwi.org

ہے، ان کی اطاعت کرنی ہے اور ان سے برابری کا معاملہ نہیں کرنا ہے۔

معاشرتی تعلیمات اور مقام نبوی

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ☆ وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ☆ فَضْلاً مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (الحجرات:٦-٨)

(اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح جانچ لو کہ کہیں تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہو اور جان رکھو کہ اللہ کے رسول تم میں موجود ہیں، اگر وہ اکثر چیزوں میں تمہاری بات مانیں گے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، البتہ اللہ ہی نے تمہارے لیے ایمان میں رغبت پیدا فرمادی اور تمہارے دلوں میں اسے سجا دیا اور کفر اور گناہ اور معصیت سے تمہیں بیزار کیا، یہی لوگ ہیں جو سیدھے راستہ پر ہیں، محض اللہ کے فضل اور اس کے انعام سے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے)

ان آیات میں اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ تم معقول ومتواضع انسان کی طرح رہو، کسی بھی معاملہ میں جلد بازی مت کرو، اگر تمہیں کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قابل تنقید ہے تو فوراً اس بات کو حضور ﷺ تک نہ پہنچاؤ کہ فلاں ایسا کرتا ہے یا فلاں جگہ ایسا واقعہ ہو گیا۔ اس حکم کی حکمت یہ تھی کہ بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بری نیت سے بات کہتے ہیں یا اس کے پیچھے کوئی دوسرا سبب ہوتا ہے اور اس کو نہ جاننے والا نہیں

سمجھتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ غلط فہمیاں عام ہوجاتی ہیں۔

حضور ﷺ ایک مرتبہ مسجد میں معتکف تھے، آپ ﷺ کے گھر مسجد سے ملے ہوئے تھے، ایک رات آپ کی اہلیہ اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے رات کے اندھیرے میں کچھ بات کررہی تھیں اور مسجد کھلی ہوئی تھی، اچانک دور سے دو انصاری صحابی کا گذر ہوا، آپ ﷺ نے زور سے ان کو کہہ کر بتایا:

"علی رسلکما إنها صفیة بنت حیی."(۱)

(ٹھہرو، یہ صفیہ بنت حیی ہیں۔)

آپ ﷺ نے فوراً وضاحت کردی کہ یہ ہماری اہلیہ ہیں، حالانکہ آپ ﷺ کے متعلق کوئی شخص بھی غلط شبہ نہیں کرسکتا تھا کہ کسی غیر خاتون کے ساتھ آپ اندھیرے میں بات کریں گے، لیکن انسان انسان ہے، اس کے ذہن میں کچھ بھی آجائے، اسی لیے آپ ﷺ نے ان سے یہ بات فرمائی، کیونکہ اگر خدانخواستہ ان کے ذہن میں کوئی غلط بات آجاتی تو ان کے ایمان کو خطرہ پیش آجاتا، اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق کسی قسم کا غلط خیال آنا ہی ایمان کے لیے خطرناک ہے۔

قرآن مجید میں ہر بات کسی کے سامنے بیان کرنے سے اسی لیے منع کیا گیا، کیونکہ اگر اسی طرح کا واقعہ کوئی شخص کہیں جاکر بیان کردے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا تو عوام میں غلط فہمیاں عام ہوجائیں گی، اس لیے فرمایا گیا کہ ایسی بات جس میں کوئی خرابی ہو، اس کے کہنے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے، قرآن مجید میں "فاسق" کا لفظ استعمال فرمایا کہ اگر فاسق آدمی کوئی خبر لائے تو اس خبر کو پھیلاؤ نہیں، بلکہ فرمایا گیا کہ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس بری نیت رکھنے والا کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح اس کی تحقیق کرلو، یعنی واضح کرلو کہ یہ خبر کہاں تک صحیح ہے، صرف اس کے کہنے میں نہ آؤ، ورنہ تم اس کے کہنے پر اگر کوئی اقدام یا کارروائی کردو گے تو بعد میں معلوم ہوگا کہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان أنه یستحب...: ۵۸۰۸

www.abulhasanalinadwi.org

یہ ہم نے غلط کام کیا، یہ تو ایسی بات ہی نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے اس فیصلہ پر نادم ہوگے، لہٰذا احتیاط سے کام لینا چاہیے، اگر کوئی ایسی بات معلوم ہوجائے تو تحقیق سے پہلے آگے نہ بڑھاؤ اور اس پر کوئی کارروائی نہ کرو۔

دوسری آیت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ حضور ﷺ کو ہر بات پہنچادینا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر تمہارے بات پہنچادینے پر آپ ﷺ عمل کرنے لگیں تو تم پریشانی میں پڑجاؤگے، اس لیے کہ اللہ کے رسول جو عمل کریں گے وہ سب کو ماننا پڑے گا اور اسی پر عمل ہوگا، گویا اگر اللہ کے رسول ﷺ تم میں موجود ہیں اور تم ان سے ہر بات جاکر کہہ دوگے یا غیر تحقیقی طریقہ اختیار کروگے تو خود تمہیں کو پریشانی ہوگی۔

امت مسلمہ کے لیے پیغام

سورۂ حجرات کی ابتدائی آیات میں بیان کی گئی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مقام کو اس طرح سمجھا جائے کہ ہمارے تمام معاملات میں اس کا اثر ظاہر ہو، نبی کے نام پر کسی بھی مجلس کے انعقاد کے وقت یہ احساس ہو کہ ہم کس کی بات سن رہے ہیں، کس کی مجلس میں بیٹھے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ایسی مبارک مجلسوں میں بھی شرکت ہو مگر اس کے باوجود ہم اپنے دوستوں سے ہم کلامی میں مست ہوں یا ایسے بیٹھے ہوں جیسے اپنے کسی ہمسر کے سامنے بیٹھے ہوں، کیونکہ نبی ﷺ کی ذات اقدس وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسی عظمت عطا فرمادی ہے کہ آپ انسان ہیں مگر عام انسانوں کی طرح نہیں، حضور ﷺ فرماتے تھے کہ میں ایک انسان ہوں، جس طرح لوگ کرتے ہیں میں بھی کرتا ہوں، فرق یہ ہے کہ اللہ نے مجھ کو نبی بنایا ہے، بس نبوت کا جو اعزاز آپ کو ملا ہے، اس سے آپ اور انسانوں سے برتر ہوگئے لیکن انسان رہے۔

نماز کی اہمیت

شعائر اللہ میں چوتھی چیز نماز ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز میں بڑی خصوصیات رکھی ہیں، اگر ان کو اس کے ساتھ ادا کیا جائے تو نماز سے آدمی کو بہت فیض اور قوت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ نماز مومن کی معراج قرار دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دو اہم چیزیں بیان کی گئی ہیں، ایک نماز اور دوسرے زکوۃ، جن سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

(البقرة: ٢٧٧)

(بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے بھلے کام کیے اور نماز قائم رکھی اور زکوۃ دی ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

محبوب عمل

اللہ تعالیٰ کو نماز کا عمل بہت محبوب ہے اور اس کی فرضیت بھی آسمان کے اوپر معراج میں ہوئی، اس کے ذریعہ بڑا روحانی عروج حاصل ہوتا ہے اور بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے، اس عبادت کی ادائیگی کے لیے جو انداز عمل اور جو قلبی احساس کی تعلیم

دی گئی ہے، اس کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس کے ہونے پر زمینی خوبی سے انسان آسمانی خوبی میں پہنچ جاتا ہے۔

نماز کی عبادت کا عمل بھی ہمہ وقت نہیں رکھا گیا، تاکہ بندہ کے لیے یہ عمل آسان رہے، ۲۴ر گھنٹے میں صرف پانچ بار، نصف یا ربع (چوتھائی) گھنٹے میں نماز کا عمل پورا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اخلاص کے ساتھ عند اللہ قبولیت رکھتا ہے، جس کا ذکر صحابہ کی تعریف میں بھی کیا گیا ہے؛

﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾ (الفتح: ٢٩)

(محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ انکاریوں پر زور آور ہیں، آپس میں مہربان ہیں، آپ انہیں رکوع اور سجدے کرتے دیکھیں گے، اللہ کا فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں، ان کی علامتیں سجدوں کے اثر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں)

اور اس عمل نماز کے اثر و فائدہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے؛

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ﴾ (العنکبوت: ٤٥)

(بلاشبہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)

دیگر عبادات اور نماز میں فرق

اسلام کے دین حق میں مقبولیت عند اللہ کے لیے عبادت کے پانچ عمل بتائے گئے ہیں، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، اس میں سوائے نماز کے ہر عمل حسب استطاعت فرض کیا گیا ہے، لیکن نماز کے متعلق جسم انسانی میں روح رہنے تک اس پر عمل کی تعلیم دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے؛

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ (الحجر: ۹۹)

(اور اپنے رب کی بندگی میں لگے رہیے یہاں تک کہ یقینی (چیز) آپ کو پیش آجائے)

نماز ایک طریقہ سے اس عالم ارضی سے اٹھ کر حضور دربار الٰہی تک پہنچا دینے والی عبادت کی حیثیت رکھتی ہے اور جنت جانے کا بڑا اور اہم راستہ ہے، اس کو اس کی صفات کے ساتھ ادا کرنے پر حصول رضائے الٰہی کا وعدہ ہے۔

نماز مؤمن کا ہتھیار

اللہ تعالیٰ نے نماز کو غیر معمولی اوصاف والا بنایا ہے، نماز انسان کو روحانی قوت بخشتی ہے، اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہے، مصیبت کے وقت انسان کو ہمت دیتی ہے اور مصائب سے نبرد آزما ہونے کے لیے اہل ایمان کا آہنی ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔

ابتدائے اسلام کے وقت جب آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے کھل کر دعوت دین پیش کی تو کفار مکہ اہل عرب کو اسلام سے روکنے کی طرح طرح کوششیں کرتے، اہل ایمان پر طرح طرح کے ظلم کرتے، اسی لیے جن لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، وہ اپنے کو شروع دور میں چھپاتے تھے، چنانچہ جب مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ نے دعوت دین کا کام کیا تو تین سال تک اخفاء کے ساتھ کام ہوتا رہا، اس کے بعد سورۂ مدثر میں حکم ہوا کہ اب کھل کر بات کی جائے، ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ☆قُمْ فَأَنذِرْ☆وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ (المدثر: ۱-۳)

(اے چادر لپیٹنے والے، اٹھ جایئے پھر خبردار کیجیے اور اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کیجیے)

اس کے بعد آپ ﷺ نے کھل کر دعوت دینا شروع کی، جس پر ظلم وزیادتی کا سلسلہ مزید شروع ہوگیا، کیونکہ جب قریش کے سامنے علی الاعلان دعوت دینے کی یہ

بات آئی تو ان کے لیڈر اور بڑے لوگ مقابلہ میں آ گئے اور انہوں نے اہل ایمان پر سختی شروع کر دی، لہٰذا ایمان والوں میں جو کمزور لوگ تھے اور جن کو خاندان کے کسی بڑے کی حمایت حاصل نہ تھی، ایسے حالات میں ان لوگوں کو بہت ظلم سہنا پڑا، ان کو گرم پتھروں پر لٹا کر گھسیٹا جاتا تھا، جس سے کئی کی موتیں ہوئیں اور جن کی موت واقع نہ ہوئی وہ ظلم وستم برداشت کرتے رہے، بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

"یا رسول اللّٰہ! إنا کنا فی عز ونحن مشرکون فلما آمنا صرنا أذلة."(١)

(اے اللہ کے رسول ﷺ! حالت شرک میں ہم لوگ عزت کے ساتھ تھے، مگر ایمان کی دولت سے سرفرازی کے بعد ذلیل ترین ہو گئے۔)

ان تمام باتوں کے جواب میں آپ ﷺ اپنے جاں نثار صحابہ سے صرف یہی کہتے تھے کہ ابھی ہم انتقامی کارروائی یا بدلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، لہٰذا تم صبر سے کام لو، دین پر ثابت قدم رہو اور نماز قائم کرتے رہو، سورۂ نساء میں مکہ کے انہیں حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾

(النساء: ٧٧)

(کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو)

انسان کی برتری

اللہ رب العزت جو تمام کائنات وموجودات کا خالق ومالک ہے، اس نے اپنی

(١) سنن النسائي، كتاب الجهاد، باب وجوب الجهاد: ٣٠٩٩

www.abulhasanalinadwi.org

مخلوقات میں سے انسان کو دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں فائق اور ممتاز رکھا اور اس کا اظہار اس کی تخلیق پر دوسروں کو اس کے سامنے جھکنے کا حکم دے کر کیا اور جس نے اس پر عمل نہیں کیا اس کو سزا دی کہ سب مخلوقات خالق کون و مکان کی ترجیح کردہ ہیں، دوسروں کو اس کے پسند کی تعمیل لازمی ہے، لیکن انسان کی جو برتری ثابت ہے وہ دراصل انسان کی ذاتی برتری نہ تھی، بلکہ وہ برتری خود انسان کو اپنے خالق و مالک کی پسندیدگی و اطاعت کی بنیاد پر ہے، جس میں خود انسان ایک بے طاعتی پر اس ہی کی تلافی کرنے والے کے ساتھ وابستہ فرما کر دنیا کے میدان عمل سے اپنی طاعت گزاری لے کر آئے اور اس کا صلہ جنت واپسی کا حاصل کرے۔

دنیا و مافیہا اور آسمان سب اس ذات برتر کی ہمہ وقت نظر میں ہیں، بندہ کا یہاں کا عمل وہاں عرش الٰہی تک اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، اس کو بخوبی علم ہے کہ دنیا میں انسان کی تابعداری و اطاعت حسب استطاعت کتنی اور کیسی تھی، دنیا میں اس کی روح صرف زمین کی خاکی گرواٹ میں پھنس گئی تھی یا اپنے کو طاہر و صاف بنا کر مقبولیت الٰہی کے لائق بنی، جس کا بہترین ذریعہ اور نمونہ نماز کی عبادت ہے کہ بندہ اپنے خالق کے سامنے زمینی زندگی سے اپنے کو پاک کر کے، پوری پاکیزگی اور توجہ کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے آجائے۔

دیگر مخلوقات کا طرز عبادت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اپنی عبادت کے لیے نماز جیسی نعمت عطا کی، یہ طریقہ عبادت ان تمام طریقوں سے جدا اور عمدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی دیگر مخلوقات کو عنایت فرمائے، یوں تو پوری کائنات ہی محو عبادت اور سربسجود ہے، گرچہ ان کے طریقے اور شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

’’جب سے یہ کائنات وجود میں آئی اس وقت سے سورج روشنی و زندگی اور حرارت کا منبع ہے اور اپنا فرض بے کم وکاست اور بے چوں و چرا انجام دے رہا ہے، چاند اپنی آب و تاب اور اپنی رفتار کے ذریعہ مہینوں اور سالوں کا تعین کرتا ہے، پہاڑ ہزاروں سال سے اپنی ڈیوٹی پر کھڑے ہیں، درخت اپنی اپنی جگہ ایستادہ اور خدا کی عبادت میں مشغول ہیں اور اپنے سایہ اور پھل سے لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں، ہوا اس انسانیت کے لیے (جو کائنات کا سردار اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے) حیات کا پیغام لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے، بادل پانی بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں اور زمین کو نئی زندگی بخشتے ہیں، اس کی وجہ سے چشمے جاری ہوتے ہیں، انسان کی پیاس دور ہوتی ہے، فصلیں تیار ہوتی ہیں اور زمین اپنا خزانہ اگل دیتی ہے، چوپائے اپنی ٹانگوں پر چلتے پھرتے دوڑتے بھاگتے اور گویا رکوع کی تصویر نظر آتے ہیں، انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں، ان کے ذریعہ لوگ سردی سے بچاؤ کا سامان اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، بہت سے جانور پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان سے بھی انسان کو مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں، یہ تمام مخلوقات جو نہ دل رکھتے ہیں نہ عقل، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں مشغول ہیں، نہ ان کے یہاں نافرمانی ہے، نہ بغاوت، نہ سرکشی، نہ اکتاہٹ، نہ یہ اسٹرائک کرتے ہیں، نہ کبھی چھٹی لیتے ہیں، گویا ہر وقت اور ہر حالت میں وہ سربسجود ہیں:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ

مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ (الحج: ۱۸)

(بھلا آپ نے نہیں دیکھا کہ سب ہی اللہ کے لیے سجدہ ریز ہوتے ہیں، جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان بھی اور بہت سے وہ ہیں جو عذاب کے مستحق ہو چکے اور جس کو اللہ ذلیل کر دے اس کو کوئی عزت نہیں دے سکتا، یقیناً اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے)

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَآبَّةٍ وَالْمَلآئِكَةُ وَهُمْ لاَ يَسْتَكْبِرُوْنَ☆يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (النحل: ٤٩-٥٠)

(اور آسمانوں میں اور زمین میں جتنے بھی جاندار ہیں اور سب فرشتے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ اکڑتے نہیں، وہ اپنے رب کا اپنے اوپر ڈر رکھتے ہیں اور جو کہا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں)

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً وَظِلالُهُم بِالْغُدُوِّ وَالآصَالِ﴾ (الرعد: ١٥)

(اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے وہ اور ان کے سائے چاہتے نہ چاہتے صبح وشام اسی کو سجدہ کرتے ہیں)

﴿الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ☆وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (الرحمن: ٥-٦)

(سورج اور چاند ایک خاص حساب کے ساتھ (گردش میں ہیں) بیلیں اور درخت سب سجدہ میں ہیں)

﴿اللّـهُ الَّـذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَـأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِیْ الْبَـحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الأَنْهَارَ☆وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنَ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ☆ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّهِ لاَ تُحْصُوهَا إِنَّ الإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾

(ابراهیم: ۳۲-۳٤)

(وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس سے تمہاری روزی کے لیے پھل نکالے اور تمہارے لیے کشتیوں کو کام پر لگادیا، تاکہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی رہیں اور تمہارے لیے ندیاں بھی کام پر لگادیں اور تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کردیا، وہ دونوں برابر اپنے کام پر لگے ہیں اور رات و دن کو تمہارے لیے مسخر کیا اور جو تم نے مانگا وہ اس نے تمہیں دیا اور اگر تم اللہ کی نعمت کا شمار کرنے لگ جاؤ تو تم اس کو گن نہیں سکتے، بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف اور بہت ناشکرا ہے)

یہ مخلوقات اپنے اشکال کے اختلاف و تنوع اور طرز عبادت کے فرق کے باوجود ایک ایسی نماز اور ایک ایسی حمد و تسبیح میں مشغول ہیں، جو ان کے فرض منصبی اور ان کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جس کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس کی چشم بصیرت اللہ تعالیٰ نے کھول دی ہو اور یہ مادی حجاب اٹھالیے ہوں؛

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالأَرْضُ وَمَن فِیْهِنَّ وَإِن مِّن شَیْءٍ إِلاَّ یُسَبِّحُ بِـحَـمْدِهِ وَلَـكِن لاَّ تَفْقَهُونَ تَسْبِیْحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِیْماً غَفُوراً﴾ (بنی اسرائیل: ٤٤)

(ساتوں آسمانوں اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے سب اسی کی تسبیح میں لگے ہیں، البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں، یقیناً وہ بڑا بردبار، بہت بخشنے والا ہے)

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ﴾

(النور: ٤١)

(کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کی تسبیح میں لگے ہیں اور پر پھیلائے ہوئے اڑتے پرندے بھی، سب اپنی عبادت اور تسبیح کو خوب جانتے ہیں اور وہ جو کر رہے ہیں اس کو اللہ خوب جانتا ہے)''(۱)

موزوں طریقہ عبادت

اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں انسان کو بلند مرتبہ عطا فرمایا، اس کو زمین میں اپنا خلیفہ قرار دیا، لہٰذا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کا طریقہ عبادت دیگر مخلوقات کی طرح یکساں ہو، بلکہ یہ ضروری تھا کہ اس کی شخصیت کے معیار پر اترنے والا ایک موزوں طریقہ عبادت انسان کو دیا جائے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نماز کا غیر معمولی قیمتی تحفہ اہل ایمان کو عطا کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''انسان اپنی خصوصیات، اپنی برتری وشرف، اپنی عقل اور اپنے قلب کی وجہ سے دوسری مخلوقات کی بہ نسبت اس بات کا زیادہ حق دار تھا کہ مسلسل حالت عبادت میں رہتا اور اپنا ہر لمحہ رکوع وسجود، حمد وتسبیح اور ذکر الٰہی میں گذارتا اور کسی وقت بھی اس کی زبان اس کے ذکر سے غافل نہ ہوتی، جو عطیات ربانی اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن انعامات کا مستحق اس کو

(۱) ارکان اربعہ: ۲۷-۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

بنایا گیا ہے، جو بے شمار نعمتیں اس پر مینہ کی طرح برستی رہتی ہیں، ان سب کا تقاضا بلاشبہ یہی تھا کہ وہ عبادت کو ایک لمحہ کے لیے بھی ترک نہ کرتا اور نماز سے پلک جھپکنے کے برابر غافل نہ ہوتا اور ان فرشتوں کی طرح ہو جاتا جن کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے:

﴿وَلَهُ مَن فِيُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ☆يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ﴾

(الأنبياء: ۱۹-۲۰)

(اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے نہ اکڑتے ہیں اور نہ اکتاتے ہیں، رات و دن تسبیح میں لگے رہتے ہیں تھکتے نہیں)

لیکن چونکہ اس کو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ بننا تھا اور نہایت نازک منصب پر فائز ہونا تھا، اس لیے اس میں خواہشات بھی رکھی گئی ہیں اور کچھ ضرورتیں بھی اس کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں، اس میں جذبات بھی ہیں اور سوز و محبت بھی، احساس الم بھی اور شعور و مسرت بھی، ذوق جستجو اور شوق علم بھی، وہ زمین کے خزینوں اور دفینوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی پوری صلاحیت و قابلیت رکھتا ہے، تعلیم اسماء کی جو خصوصیت و امتیاز اس کو حاصل ہے، وہ دراصل اس کی فطری استعداد کا رمز اور خلافت ارضی کا مظہر ہے؛

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّيُ جَاعِلٌ فِيُ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْا أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَن يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّيُ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ☆وَعَلَّمَ آدَمَ

الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَـؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ☆قَالُوا سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ☆قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾

(البقرة: ۳۰-۳۳)

(اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ بولے کہ تو ایسوں کو اس میں (نائب) بنانے والا ہے جو اس میں بگاڑ کریں گے اور خون بہائیں گے اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری بزرگی بیان کرتے ہیں، اس نے فرمایا کہ یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو تمام نام سکھا دیے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا کہ مجھے ان تمام (چیزوں) کے نام بتادو اگر تم سچے ہو، وہ بول اٹھے کہ تیری ذات پاک ہے ہم کو تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہم کو سکھا دیا، بے شک تو بڑے علم والا حکمت والا ہے، (اللہ نے فرمایا) اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتادو پھر جب وہ ان کو ان کے نام بتا چکے تو اس نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے ڈھکے چھپے سے واقف ہوں اور اس کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اس کو بھی جو تم چھپائے رہتے ہو)

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً﴾ (البقرة: ۲۹)

(وہی ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے وہ تمہارے لیے پیدا کیا)

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيَ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾
(الأعراف: ۳۲)

(پوچھئے کہ کس نے اللہ کے (دیئے ہوئے) زینت (کے سامان) حرام کیے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں اور صاف ستھری کھانے کی چیزیں)

اس اہم اور نازک منصب کی ذمہ داریوں کو نباہنے اور اس خاص مقصد کی تکمیل کے لیے جس کے لیے اس کی تخلیق کی گئی، اس کو اجرام فلکی، پہاڑوں، نباتات، جمادات اور حیوانات کی طرح مسلسل قیام، مسلسل رکوع، مسلسل سجود اور مسلسل تسبیح وذکر کا پابند نہیں کیا گیا اور اگر وہ کبھی اس کی کوشش کرے گا تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کرے گا اور ان فرشتوں کے اعتراض کو حق بجانب ثابت کرے گا جنہوں نے اس کے بجائے اس بناء پر اپنی خدمات پیش کی تھیں اور اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھا تھا کہ وہ ہمیشہ تسبیح وتحمید اور ذکر وعبادت میں مشغول رہتے ہیں؛

"وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ."

ان تمام باتوں کے پیش نظر انسان کے لیے ایک ایسے طرز عبادت یا نظام عبادت کی ضرورت تھی جو اس کی فطرت، اس کے فرائض منصبی، اس کائنات میں اس کے مرتبہ ومقام اور اس ذمہ داری اور فریضہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو خلافت الٰہی کی صورت میں ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے، ایک طرف عبادت اس کے لیے ضروری بھی تھی، اس لیے کہ اس کی فطرت کا تقاضا' اس کے وجود کا منشا، اس کے ضمیر کی آواز، اس کی شرافت واحسان مندی کا اظہار، انسانیت کی ضرورت اور قلب وروح کی غذا ہے،

دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یہ عبادت اس کے قد و قامت اور شخصیت کے مطابق اور اس کی نازک اور اہم حیثیت اور اس کائنات میں اس کے منفرد مقام کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اس لباس کی طرح ہو جو اس کے قد و قامت پر پوری طرح راس آئے اور زیب دے، نہ تنگ ہو، نہ ڈھیلا، نہ کم ہو، نہ زیادہ۔

نماز درحقیقت یہی لباس ہے جو ٹھیک ٹھیک اس کے وجود پر پورا اتر رہا ہے اور جس میں کسی قسم کی کوئی کمی بیشی نظر نہیں آتی:

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (الملك: ١٤)

(کیا وہی نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا اور وہ بڑا باریک بیں اور پوری خبر رکھنے والا ہے)

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (القمر: ٤٩)

(ہم نے ہر چیز کو ناپ تول کر ہی پیدا کیا ہے)''(۱)

نماز کے متعلق ہدایات

نماز جیسی غیر معمولی عبادت کے لیے ضروری تھا کہ اس کے متعلق اہم ہدایات بھی دی جائیں، تاکہ انسان ربانی ہدایات کی روشنی میں بہتر سے بہتر طریقہ پر اس عبادت کو ادا کر سکے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''نماز کی ایمانی و روحانی فضا کی تقویت و تکمیل کے لیے جو آداب اور حکیمانہ و پیغمبرانہ تعلیمات و ہدایات دی گئی ہیں، وہ اس میں خشوع و خضوع اور سکینت و وقار پیدا کرنے کی ضامن ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ

(۱) ارکان اربعہ: ۳۰-۳۳

(اگر تم میں سے کوئی شخص نماز میں ہے تو وہ اپنے رب سے ہم کلام ہے، اس کو چاہیے (کہ ضرورت پڑنے پر) اپنے آگے یا اپنے دائیں نہ تھوکے بلکہ بائیں طرف اور پیروں کے نیچے۔)(۱)

نمازی کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ امام کی تقلید واتباع کرے، اس لیے کہ اس میں انتشار وافتراق سے حفاظت اور اپنی خواہشات سے رہائی ہے، نہ اس کو امام سے آگے بڑھنا چاہیے، نہ اس سے پیچھے رہنا چاہیے، اسی طرح اس کو صرف ایک ہیئت اور ایک شکل پر باقی رہنے کی بھی اجازت نہیں، خواہ اس کو اس میں کتنی ہی لذت محسوس ہو رہی ہو اور وہ دیر تک اسی ہیئت پر رہنا چاہتا ہو، اس لیے کہ نماز کی روح اطاعت وفرماں برداری اور رسول کی تقلید و پیروی ہے، نہ کہ وجدان و ذوق کی تابع داری اور خواہشات نفس پر عمل، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے؛

"صلوا كما رأيتمونی أصلی."(۲)

(نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔)

چنانچہ مقتدی اس پر مجبور ہے کہ ساری حرکات وسکنات میں امام کی پیروی کرے اور سر مو بھی اس میں فرق نہ پڑے؛

"إنما جعل الإمام ليؤتم به."(۳)

(امام اس لیے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔)

مساجد میں اللہ تعالیٰ کی عظمت سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں کسی مخلوق کی کوئی عزت یا کسی "بڑے" کی کوئی خصوصیت

(۱)البخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب المصلی یناجی ربہ عزوجل: ۵۳۲
(۲)البخاری، کتاب الأذان، باب الأذان للمسافر إذا کانوا جماعۃ: ۶۳۱
(۳)البخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی السطوح والمنبر والخشب: ۳۷۸

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں، وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں آقا وغلام، حاکم ومحکوم اور امیر وفقیر سب مساوی نظر آتے ہیں، وہ ''منیٰ'' کی طرح ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے:

"لا مِنًی مناخ من سبق"(۱)

(منیٰ اس کی فرودگاہ نہیں ہے جو پہلے پہنچ جائے۔)''(۲)

(۱)سنن الترمذی، أبواب الحج، باب ما جاء أن منی مناخ من سبق: ۸۹۰

(۲)ارکان اربعہ:۷۹-۸۰

www.abulhasanalinadwi.org